حافظ جی
سعید لخت

حافظ جی

10 سال سے 100 سال تک کے
بچّوں کے لیے

سعید لخت

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

کہانیاں

حافِظ جی

ایک دِن جب ہم نے بی پڑوسن کا گھڑا غُلّہ مار کر توڑ دیا تو بڑی گڑبڑ مچی۔ ابّا جان شام کو گھر آئے تو امّی بولیں "اے میں نے کہا سُنتے ہو۔ اپنے لاڈلے کے کچھن تو دیکھو۔ اس نے تو سارا مُحلّہ سر پر اُٹھا رکھا ہے۔"

ابّا جان بولے "لاحولَ ولا قُوّۃ ۔ حد کر دی۔ اِتنا سا بچّہ مُحلّہ کیسے اُٹھا سکتا ہے۔"

امّی بولیں "اے تمھیں تو سُوجھتا ہے مذاق۔ میں کہتی ہُوں ۔ اللہ رکھے اب یہ پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ اب اس کی پڑھائی کا بھی تو کچھ بندوبست کرو۔

یہ کب تک یونہی مارا مارا پھرتا پھرے گا؟"

ابا جان کو تو ہم سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ سر پر دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے بولیں" ابا جان، ایمان سے یہ بہت شیطان ہو گیا ہے۔ کل میں سہیلیوں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ پیچھے سے آ کر ایک دم میری پیٹھ پر چڑھ گیا اور چٹیا کھینچ کر بولا" چل، بھائی لوہاری دو آنے سواری۔"

ہم چیخ کر بولے" جھوٹ۔ ہم نے کب دو آنے کہا

تھا۔ ہم نے تو تین آنے کہا تھا۔"

ابا جان ہنسی روک کر بولے" لاحول ولا قوۃ۔ یعنی حد کر دی۔"

امی نے ابا جان کی ناک کے سامنے انگلی نچائی اور بولیں" اے حد نہیں کرے گا تو کیا کرے گا۔ آخر بیٹا کس کا ہے؟"

ابا جان سوچتے ہوئے بولے" بیٹا کس کا ہے!۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی بیٹا ہمارا ہے اور کس کا ہونا۔ تم بھی حد کرتی ہو۔"

"اے تم تو حدیں کھودتے رہو گے اور بچے کا ستیاناس ہو جائے گا۔" امی جان جھلا کر بولیں" میں کہتی ہوں اسے سکول میں بھرتی کرا دو۔ ڈنڈے کھا کر آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ابا جان چونک کر بولے" اسے بھرتی کرا دوں؟ یعنی سکول نہ ہوا کوئی فوج پلٹن ہو گئی۔ حد کر دی۔"

"خدایا میری توبہ" امی جان سر پکڑ کر بیٹھ گئیں" تم سے تو وہ بات کرے جو دس سیر گھی اور دو بوری بادام کھا

کر آیا ہو۔"

"اچھا بھئی ناراض مت ہو۔" ابا جان صُلح کرتے ہوئے بولے: "سکول میں تو میں اسے داخل کرا دوں مگر تمھیں معلوم ہے وہ کتنی دور ہے۔ اتنا سا بچّہ اکیلا وہاں تک کیسے جائے گا— ارے ہاں یہ اپنے محلّے کے حافظ جی کو تو ہم بھول ہی گئے۔ محلّے کے بچّے ان ہی کے پاس تو پڑھتے ہیں۔"

"اے لو۔ میری سمجھ پر پتّھر پڑیں۔ حافظ جی کا تو مجھے خیال آیا ہی نہیں۔" امّی جان خوش ہو کر بولیں۔

"بس بس کل ہی چوکؔ کی جلیبیاں لے جا کر اسے حافظ جی کے حوالے کر دو۔"

چنانچہ صاحب خدا تمھارا بھلا کرے اور ساتھ میں ہمارا بھی، صبح کو ابا جان چوکؔ کی جلیبیاں لائے اور ہمیں حافظ جی کے سپرد کر آئے۔

اللہ میاں نے دُنیا میں عجیب عجیب چیزیں پیدا کی ہیں۔ ان ہی چیزوں میں ایک عجیب چیز حافظ جی بھی تھے۔ ڈبلے پتلے، چیچک سے بھرا چہرہ۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ کچُبا ڈاڑھی۔ جب غُصّہ آتا تو ٹوپی کا پھندنا کھڑا ہو جاتا اور

ڈاڑھی تھر تھر کانپنے لگتی - جنم کے اندھے تھے مگر آنکھیں
کھلی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پُتلیوں کے
بجائے آنکھوں میں کانچ کی گولیاں رکھی ہیں -

حافظ جی حافظ بھی تھے اور قاری بھی - اس لیے
حلق میں بولتے تھے - جب ابّا جان چلے گئے تو اُنھوں
نے ہمیں اِدھر اُدھر سے ٹٹول کر دیکھا اور پھر بولے

"کیا نام ہے تم عالا ؟"

ہم نے کہا "س س س سعید"

بولے "اچھا - چلو قاعدہ کھولو -"

قاعدہ ہمیں ابا جان نے گھر پر پڑھا دیا تھا - ہم
نے فر فر سُنا دیا - حافظ جی بہت خوش ہوئے - بولے
"عرے تو تو بہت تیز ہے - عیں -"

پہلا دِن تو ساتھ خیریت کے گزر گیا - لیکن دوسرے
دِن ہماری شامت آ گئی - حافظ جی نے ہمیں الف لام میم
کا پارہ شروع کرایا - بولے "پڑھو آعوذُ باللہِ"

ہم نے کہا "آعُوذُ باللہِ"

بولے "آ اُو نہیں آعُو - عُو - عُو - عین کو حلق سے

نکالو -"

ہم نے بہتیرا زور لگایا مگر عین حلق سے نہیں نکلی.
اب تو حافظ جی بہت گرم ہوئے - بایاں ہاتھ گھما کر
ہماری گردن پر جو مارا ہے تو ہم قلا بازی کھا کر دور
جا پڑے - حافظ جی نے ٹانگ پکڑ کر ہمیں کھینچ لیا
اور کمر پر ایک زور کا دھموکا لگا کر بولے "ہاں - کہو
آعُو - عُو - عُو -"

روتے روتے ہماری ہچکی بندھ گئی - ناک سے پانی
بہنے لگا - ہم نے ناک کو کُرتے کے دامن میں دبا کر زور
سے جھاڑا تو آواز نکلی "ھُوں - اُوں - اُوں -" حافظ جی
خوش ہو گئے - بولے "شاباش - دیکھا - اب کہا نا آعُو -
چل اب آگے پڑھ -"

حافظ جی کو شاید کسی حکیم نے بتایا تھا کہ جب تک
دو چار بچّوں کو نہیں مارو گے تب تک تمھارا کھانا ہضم
نہ ہو گا - روزانہ کسی نہ کسی کی شامت آتی - شروع کے
ایک دو ہفتے ہم پر بہت سخت گزرے - نئے نئے
تھے - کبھی مار کھائی نہ تھی مگر پھر ہم بھی چنٹ ہو گئے.

ہم نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔
جب حافِظ جی ہمیں مارنے کو لپکتے تو ہم پاس بیٹھے
ہُوئے کسی بچّے کا ہاتھ پکڑ کر حافِظ جی کے ہاتھ میں
تھما دیتے۔ حافِظ جی کو کچھ دِکھائی تو دیتا نہیں تھا۔ وہ
اس غریب کو ہی دُھننا شروع کر دیتے۔

حافِظ جی کو مُرغا بنوانے کا بھی بہت شوق تھا۔
مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے "چل مُرغا بن۔ جب

تک میں نہ کہوں، کان نہ چھوڑنا۔ بے چارہ بچّہ ڈر کے
مارے مُرغا بن جاتا۔ اِدھر وہ مُرغا بنتا اور اُدھر ہم
اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے۔ وہ درد کے مارے چیختا۔
"حافِظ جی۔ ہائے حافِظ جی۔" حافظ جی کہتے "ہُوں۔
اب چیختا ہے۔ سبق کیوں یاد نہیں کیا تھا؟"

صُبح کو حافِظ جی کا لڑکا انھیں مدرسے چھوڑ جاتا۔
مگر چُھٹی کے بعد مدرسے کے بچّے باری باری انھیں گھر
پہنچانے جاتے۔ جب ہماری باری آتی تو بڑی گڑ بڑ
ہوتی۔ حافِظ جی ایک ہاتھ ہمارے کاندھے پر رکھ لیتے۔
ہمارے پیر تو زمین پر ہوتے اور آنکھیں آسمان پر،
جہاں رنگ برنگی پتنگیں اُڑ رہی ہوتیں۔ راستے میں کوئی
گڑھا یا نالی آتی تو سب سے پہلے اِس میں ہم گرتے
اور پھر حافِظ جی بھی اللہ کا نام لے کر گر پڑتے۔

ہر بچّہ حافِظ جی کو مہینے میں چار آنے دیتا تھا۔ ہمارا
گھرانا ذرا بڑا تھا۔ ہم آٹھ آنے دیتے تھے۔ اس کے
علاوہ حافِظ جی مہینے میں دو تین ختم بھی پڑھتے تھے۔
اس طرح انھیں آٹھ دس روپے ماہ وار کی آمدنی ہو
جاتی تھی۔ سستا سمے تھا ایک آنے کی چار روٹیاں
ملتی تھیں اور سالن مُفت۔ غریب غُربا بھی لنگوٹی میں

پھاگ کھیلتے تھے۔

ہمارے ابّا جان نے ہمیں ختم میں جانے کو منع کر دیا تھا۔ مگر توبہ کیجیے۔ جہاں مٹھائی کی بات ہو وہاں کون سا ایسا بچّہ ہو گا جو نہ جائے۔ ہم بھی بچّوں کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔

اگر مرنے والا امیر ہوتا تو حافظ جی بہت دیر تک دُعا مانگتے اور بچّے بھی خوب زور زور سے آمین کہتے۔ کیوں کہ یہاں مٹھائی وغیرہ زیادہ ملتی تھی۔ غریب ہوتا تو حافظ جی اسے چار پانچ منٹ ہی میں ٹرخا دیتے اور بچّے بھی بڑی مری ہوئی آواز میں آمین کہتے۔ بلکہ آپ سے کیا پردہ، ہم تو چُپ ہی رہتے اور دل میں سوچتے کہ ایسے آدمی کے مرنے کا کیا فائدہ جس کے ختم پر ایسی سڑی بُسی مٹھائی ملے۔

معصوم بچّے، انھیں کیا پتا کہ موت کیا ہوتی ہے اور زندگی کِسے کہتے ہیں۔ انھیں مٹھائی کھانے کو ملتی تو وہ بہت خوش ہوتے اور صبح کو جب مدرسے آتے تو ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے:

"اللہ میاں، آج بھی کوئی مُردہ مر جائے۔"

مُلّا پُلاؤ

"اٹن شن" مُلّا پُلاؤ کڑک کر بولے۔

سب لڑکے اکڑ کے کھڑے ہو گئے۔

مُلّا پُلاؤ نے تھوڑی دیر ڈاڑھی کھجائی اور پھر زور سے بولے "سینہ نکال کے، پیٹ پچکا کے کوئیک مارچ۔ لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ۔۔۔ لیفٹ۔۔۔"

ہم فوج کے جرنیل تھے۔ اس لیے سب سے آگے ہوتے تھے۔ چلتے چلتے آگے دیوار آئی۔ دیوار پر سیڑھی لگی تھی۔ جب ہمیں "رائٹ ٹرن" یا "لیفٹ ٹرن" کا آرڈر نہیں ملا تو ہم نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ فوج نے دیکھا کہ جرنیل صاحب دیوار پر چڑھ رہے ہیں تو وہ

بھی چڑھنے لگی۔

مُلّا پُلاؤ کوئک مارچ کا حکم دے کر تھیلے سے شیشہ
نکال کر، مونچھیں درست کرنے لگے تھے۔ اس لیے انھوں
نے فوج کو دیوار پر چڑھتے ہوئے نہ دیکھا۔ تھوڑی دیر
بعد منھ اوپر اٹھایا تو بھنّا کر بولے "ارے ہالٹ! ارے
نامعقولو ہالٹ! یہ کیا حرکت ہے؟ فوج کہیں دیوار پر
بھی چڑھتی ہے؟ اُترو نیچے۔ میں کہتا ہوں اُترو۔"

یہ تھے ہمارے اردو اور دینیات کے اُستاد۔ مولوی

صبغتُ اللہ برکاتی جنھیں ہم سب مُلّا پُلاؤ کہتے تھے۔ ساٹھ
ستّر سال کے پیٹے میں ہوں گے۔ سر، ڈاڑھی، بھویں بلکہ
پلکیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ مگر دم خم ایسے تھے جیسے
کوئی بیس برس کا کڑیل جوان۔ جاڑے ہوں کہ گرمی ہمیشہ
ململ کا انگرکھا پہنتے۔ البتہ سردیوں میں ایک اُونی چادر
اوڑھ لیتے تھے۔ آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ اِس محلّے
بولیں تو اُس محلّے سُنائی دے اور جب چلتے تو ایسی
زور سے پیر مارتے کہ زمین تھرّا اُٹھتی۔

بعض لوگوں کو اللہ میاں سب سے نرالا بناتا ہے۔
ان کی چال ڈھال، بات چیت اور لباس وغیرہ میں کوئی
نہ کوئی عجیب بات ایسی موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے
وہ دوسروں سے بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ مُلّا پُلاؤ
بھی ایسے ہی عجیب و غریب اور دل چسپ آدمیوں میں سے
تھے۔ انھیں پُلاؤ کھانے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے
سارا شہر انھیں مُلّا پُلاؤ کہتا۔ امیر ہو کہ غریب، جس کسی
کے گھر کوئی خوشی یا غمی ہوتی تو وہ مُلّا پُلاؤ کو ضرور بُلاتا۔
اکیلے آدمی تھے۔ نہ بیوی تھی نہ بچّے۔ اس لیے جینے کے

تیسوں دِن دعوتوں میں گزرتے اور بہت کم ایسا ہوتا
کہ مولوی صاحب کے گھر چولھا جلتا۔

مُلّا صاحب ہر وقت ایک چھوٹا سا تھیلا اپنے ساتھ
رکھتے تھے۔ جس میں قینچی، کنگھی، شیشہ اور سُرمہ دانی
ہوتی تھی۔ فرصت کے وقت تھیلا کھول کر اپنا بناؤ سنگھار
کرتے اور اگر سکول میں کسی بچے کو میلا کچیلا دیکھتے تو فوراً
نلکے پرلے جا کر اس کا مُنہ دُھلاتے، سُرمہ لگاتے اور
بالوں میں کنگھی کر کے کہتے "دیکھ بے، اگر کل اِس طرح بھنگی
بن کر آیا تو دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دوں گا۔"

مُلّا پلاؤ اردو اور دینیات کے اُستاد ہونے کے عِلاوہ
ڈرِل ماسٹر بھی تھے۔ روزانہ صُبح سویرے سکول کے صحن
میں پریڈ ہوتی تھی۔ ہمیں جرنیل بنایا گیا تھا۔ ہم جھنڈا
اُٹھائے سب سے آگے ہوتے تھے۔ جب سب لڑکے
آگے پیچھے لائن میں کھڑے ہو جاتے تو مُلّا پلاؤ کڑک کر
حکم دیتے: "اٹن شن — سینہ نکال کے، پیٹ پچکا کے،
کوئک مارچ۔ لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ۔ لیفٹ"
اب مُصیبت یہ تھی کہ جب فوج مارچ شروع کر دیتی

تو خود آں جناب شیشہ نِکال کر اپنی صورت دیکھنے لگتے۔
اور زبان سے کہے جاتے "لیفٹ۔ لیفٹ۔ لیفٹ۔"

نتیجہ یہ ہوتا کہ فوج یا تو دیوار پر چڑھ جاتی اور یا
پھاٹک سے باہر نکل کر بازار میں گھومنا شروع کر دیتی۔
جب آپ کو ہوش آتا تو پیچھے پیچھے بھاگے آتے اور
زور زور سے چیختے "ارے ہالٹ، ابے نالائقو،
اباؤٹ ٹرررن۔"

ہمیں یاد نہیں کہ مُلّا پلاؤ نے کبھی کسی لڑکے کو مارا
ہو۔ مارنا تو بڑی بات ہے کبھی ڈانٹتے ڈپٹتے بھی نہیں
دیکھا۔ بڑی محبت اور بڑے پیار سے پڑھاتے۔ پڑھاتے
کیا، یُوں کہو، گھول کے پلاتے۔ کبھی کوئی بچہ شرارت
کرتا یا سبق یاد نہ کرتا تو بس اِتنا کہتے "ابے، کانوں
کے بیچ میں سر کر دوں گا۔"

ایک دِن کلاس میں آتے تو زور سے بولے:
"اسٹینڈ اپ۔ اٹن شن۔ کوئک مارچ" پھر بولے:
"نہ نہ نہ۔ ناٹ کوئک مارچ۔ سِٹ ڈاؤن۔ سِٹ ڈاؤن"
لڑکے بیٹھ گئے تو پہلے تو آپ نے سفید بُراق ڈاڑھی

میں اُنگلیاں پھرائیں اور ایک آنکھ میچ کر بولے "ہم
نے آج تک کبھی —— تمھیں کوئی سزا نہیں دی۔
آج تم سب مُرغا بنو ——"

سب لڑکوں نے گھبرا کر ایک دُوسرے کی طرف
دیکھا۔ ہم بولے "مولوی صاحب، ہمارا قصُور کیا ہے؟"
بولے "قصُور وصُور میں نہیں جانتا۔ بس سیدھی طرح
مُرغا بنو۔ اور میاں سعید، چُوں کہ تم مانیٹر ہو اِس
لیے سب سے پہلے تم مُرغا بنو۔"

ہم نے کہا "مولوی صاحب، ہمیں تو معلُوم نہیں
کہ مُرغا کیسے بنتے ہیں۔"

حیرت سے بولے "ابے پانچویں جماعت میں پڑھتا
ہے اور ابھی تک تجھے مُرغا بننا نہ آیا؟ طارق میاں،
تُم سعید کو مُرغا بن کے دِکھاؤ۔"

طارق نے پہلے تو بغلیں جھانکیں پھر مُسمسی صُورت
بنا کر بولا "مُرغا بننا تو مجھے بھی نہیں آتا۔"

مُلّا پُلاؤ بہُت جھُنجھلائے۔ باری باری تمام لڑکوں
سے پُوچھا اور جب سب نے کانوں پر ہاتھ دھرے

کہ جناب ہمیں مُر۔ بننا نہیں آتا تو آپ غُصّے میں کھڑے
ہو گئے اور بولے ذرا سوچو تو لوگ کیا کہیں گے کہ
مولوی صِبغۃُ اللہ صاحب برکاتی کے شاگرد اور انھیں
مُرغا بننا بھی نہیں آتا۔ فرض کرو کل کلاں کو
اِنسپکٹر صاحب آ گئے اور اُنھوں نے تمھیں مُرغا
بننے کے لیے کہا تو کیسے بنو گے؟ تُم تو میری
بھی ناک کٹواؤ گے۔ لو دیکھو اور یاد رکھو۔ اِس
طرح بنتے ہیں مُرغا ——"

یہ کہہ کر آپ نے ٹانگوں میں ہاتھ ڈالے اور
کان پکڑ کر مُرغا بن گئے۔

سب بچّے ہاتھوں میں مُنھ دبائے کھوں کھوں
ہنس رہے تھے۔ اِتّفاق کی بات ہیڈ ماسٹر صاحب

کسی ضرورت سے اُدھر آ نکلے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ مُلّا پُلاؤ مُرغا بنے کھڑے ہیں تو پہلے تو آنکھیں جھپکا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر مُلّا پُلاؤ سے بولے:

"اجی مولوی صاحب، اجی میں نے کہا قبلہ۔ یہ کیا ناشائستہ حرکت کر رہے ہیں آپ؟"

مُلّا پُلاؤ نے کان چھوڑ دیئے اور جھلّا کر بولے "بیس برس ہو گئے آپ کو پڑھاتے ہوئے اور ابھی تک آپ نے بچّوں کو مُرغا بننا بھی نہیں سکھایا——"

ایک دفعہ شہر میں ایک ناٹک کمپنی آئی۔ ہماری شامت جو آئی تو مُلّا پُلاؤ بھی ناٹک دیکھ آئے۔ دُوسرے دِن اُردُو کا گھنٹا شرُوع ہُوا تو بولے "اٹن شن۔ کتابیں بند"

لڑکوں نے کتابیں بند کر دیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اب مولوی صاحب کوئی مزے دار کہانی سُنائیں گے۔ آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتے رہے پھر ایک آنکھ کھول کر بولے "دیکھو بھئی، دو مہینے بعد سکُول کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے۔ ہمیں ابھی سے مشق شرُوع کر دینی چاہیے۔"

ہم بولے "کاہے کی مشق مولوی صاحب؟"

بولے "ڈرامے کی اور کاہے کی۔ اس دن ہم ایک ڈراما یعنی ناٹک کھیلیں گے۔ ڈراما میں نے لکھ لیا ہے۔ اس کا نام ہے "جہانگیر کا اِنصاف" یہ کہانی تُم چوتھی جماعت میں پڑھ چُکے ہو۔ بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نُورجہاں محل کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ سامنے سے ایک دھوبی گزرا۔ [illegible] ملکہ کو دیکھ لیا۔ ملکہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بس گولی مار دی——"

"ہاں۔ ہاں مولوی صاحب، ہمیں یاد ہے۔" ہم نے خوش ہو کر کہا۔ سب لڑکوں کے دِل خوشی کے مارے دھڑکنے لگے۔

مُلّا پُلاؤ ایک آنکھ میچ کر بولے "جہانگیر تو ہم بنیں گے اور طارق میاں تُم دھوبی بنو گے کیونکہ تمھاری صُورت دھوبیوں سے ملتی جُلتی ہے۔ اب رہی۔ نُورجہاں... تو..."

یہ کہہ کر آپ نے تمام لڑکوں پر ایک چھلتی ہُوئی نظر ڈالی اور آخر میں اپنی گول گول آنکھیں ہمارے

چہرے پر جما دیں - ہم نے خطرے کو بھانپ لیا -
جلدی سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور گھبرا کر
بولے " نہیں - نہیں - مولوی صاحب - میں نورجہان
نہیں بنوں گا -"

طارق بولا " مولوی صاحب ، سعید ہی کو نورجہان بنایئے
اس کے بال بھی بڑے بڑے ہیں -"

رشید بولا " بالکل ٹھیک - اس کی آواز بھی نورجہاں
جیسی ہے -"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں - کلاس میں ایک شور مچ
گیا - مُلّا پلاؤ میز پر گھونسا مار کر بولے -

" خاموش - خاموش - ہم نے جو کہہ دیا - وہ اٹل ہے -
سعید میاں ، تم نورجہاں بنو گے اور ضرور بنو گے "

طارق بھی ایک ہی استاد تھا بولا " مگر مولوی صاحب -
نورجہاں تو عورت تھی - وہ زنانہ کپڑے پہنتی تھی -
ایسے کپڑے کہاں سے آئیں گے ؟"

مُلّا پلاؤ بولے " ہم بنوائیں گے - نیلا شیفون کا
دوپٹا جھلمل کرتا ہوا - بوسکی کا جمپر اور مخمل کا غرارہ -

آہا - واہ وا -"

لڑکے اور لڑکیاں دونوں خدا کے بندے ہیں اور
کسی طرح ایک دوسرے سے کم نہیں - مگر خدا معلوم
کیا بات ہے کہ کسی لڑکے کو لڑکی کہہ دو تو وہ
مارنے مرنے پر تیار ہو جائے - لڑکی کو لڑکا کہہ دو
تو وہ ایسا منہ بنائے جیسے کھٹی املیاں کھا کے آئی
ہے - ہم نے جو دیکھا کہ ہمیں لڑکی بننا پڑے گا تو
روتے روتے ہمارا بُرا حال ہو گیا - آنکھوں سے ساون
بھادوں کی ایسی جھڑی لگی کہ ندی نالے بہہ گئے - لڑکے
تو قہقہہ مار کر ہنسنے لگے مگر مُلّا پلاؤ گھبرا گئے - دوڑے
دوڑے آئے - رومال سے ہمارے آنسو پونچھے اور
دم دلاسا دے کر بولے " ارے پگلے رونا کیوں ہے ؟
جا - تو نہ بننا نور جہاں - ہم بن جائیں گے - بس اب
ہنس دے - کھل کھلا کے - ہی ہی ہی ہی -"

نہ تو وہ ڈراما ہوا اور نہ ہم نورجہاں بنے - مگر
سکول کے لڑکوں نے ہمارا نام ہی نورجہاں رکھ دیا -
ہوتے ہوتے سارے شہر میں ہم نورجہاں مشہور ہو گئے -

جب ہمیں کوئی نورِ جہاں کہتا تو ہم شرم سے کٹ کٹ جاتے۔ مارے لاج کے اس طرح منہ چھپاتے، جیسے سچ مچ کی نورِ جہاں ہوں۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ عقل کچی تھی۔ ہمیں یہ پتا نہیں تھا کہ عورت یا لڑکی ہونا شرم کی بات نہیں۔ بلکہ اتنی ہی فخر کی بات ہے جتنی کہ لڑکا ہونا یا مرد ہونا۔

اور ایک دن — جب ہم سکول گئے تو ہم نے دیکھا کہ تمام بچے صحن میں جمع ہیں۔ استاد کوئی بھی نہیں۔ بچوں کے چہرے اترے ہوئے تھے، اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ہم نے بستہ گملے پر پٹخا اور طارق سے پوچھا "کیا بات ہے۔؟" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا "مم مم ملّا۔ پلاؤ مم مم مر گئے۔ سب ماسٹر ان کے گھر گئے ہیں۔ ہم سے کہہ گئے ہیں کہ یہیں ٹھہرنا۔ ہم ان کے لیے دعا مانگیں گے۔"

دوپہر کو ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے استاد واپس آ گئے۔ سب نے فاتحہ پڑھی۔ ہم نے گڑگڑا

کر دعا مانگی کہ "اے اللہ میاں تو ملّا پلاؤ کو جنت میں ہیڈ ماسٹر بنا دینا اور انھیں روزانہ پلاؤ کھانے کو دینا۔"

دعا کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ بولے "چند روز پہلے مولوی صاحب مرحوم نے یہ لفافہ مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد اسے سب کے سامنے کھولنا۔"

انھوں نے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"میں مولوی صبغۃ اللہ برکاتی ولد مولوی برکت اللہ برکاتی، یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری تمام کتابیں پبلک لائبریری کو دے دی جائیں۔ کپڑے لتے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ باقی چیزیں بیچ دی جائیں۔ میرے پاس کچھ نقدی بھی ہے — اس روپے سے سکول میں کتابوں کی ایک دکان کھولی جائے اور اس سے جو آمدنی ہو وہ غریب بچوں کی پڑھائی پر صرف کی جائے۔"

سال گرہ

ابّا جان کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ امّی جان لپک جھپک اندر داخل ہوئیں اور ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں "توبہ ہے۔ جب دیکھو کوئی کتاب، جب دیکھو کوئی رسالہ، جب دیکھو کوئی اخبار ناک سے لگا ہے۔"

پاس ہی ہم بیٹھے سیما کے ساتھ کیرم کھیل رہے تھے۔ ابّا جان نے عینک کے اوپر سے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "سعید بیٹے، ذرا دیکھنا۔ اخبار میری ناک سے لگا ہے کہ آنکھوں سے؟"

امّی جان کرسی گھسیٹ کر پاس ہی بیٹھ گئیں اور

بولیں "اے وہ ناک سے لگا ہو کہ آنکھوں سے۔ لگا ہر وقت رہتا ہے۔ توبہ ایسا بھی کیا پڑھنا۔ یاد ہے،

اِتنی بڑی بڑی آنکھیں تھیں تمھاری۔ اب سُکڑتے سُکڑتے بٹن کے برابر رہ گئی ہیں۔"

"اماں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" ابّا جان بولے۔

"چھوڑو، اِن باتوں کو۔ لو، ایک خبر سُنو۔ لکھا ہے "پشاور ۲۸ر جون۔ کل یہاں ایک..."

امّی جان نے اخبار چھین کر پرے پھینک دیا اور بولیں "اپنی خبر بعد کو سُنانا پہلے میری خبر سُن لو۔"

لاہور 29، جون - پرسوں یکم جولائی بروز اتوار، برخوردار
سعید میاں کی تیرھویں سالگرہ ہے اور ان کے
والد صاحب کو خبر ہی نہیں - وہ بیٹھے اخبار پڑھ
رہے ہیں۔"

ابا جان اُچھل کر بولے" پرسوں سعید کی سالگرہ
ہے ؟ ارے واہ وا وا - چلو، اسی خوشی میں چلم
بھر لاؤ -"

"اے نوج جو میں تمہاری چلمیں بھروں -" امی جان
نے ٹھنک کر کہا - پھر سیما سے بولیں "اے سیما، لپک
کے جا اپنی امی کو بلا لا - کہنا جیسی بیٹھی ہو یا لیٹی
ہو ویسے ہی چلی آؤ -"

سیما سر کھجاتے ہوئے بولی :" اے خالہ جان، وہ
تو نہا رہی ہیں -"

"اماں لاحول ولا قوۃ -" ابا جان ہنس کر بولے:
"کہنا نہا کر آئے -"

ہماری خالہ جان، خدا بخشے، لاکھوں میں ایک تھیں
نام تو تھا شمسہ مگر امی انھیں شمسو کہتیں - وہ ہمارے

پڑوس ہی میں رہتی تھیں - ان کے ایک
ہی بچی تھی، سیما - لےسے ہی اللہ آمین سے پال پوس
کر آٹھ سال کا کیا تھا -

تو خیر صاحب ہماری ان خالہ کی ایک عادت بڑی
دل چسپ تھی - ہمیشہ ایک بات کو دو دفعہ کہا
کرتیں - ایک دفعہ چڑیا گھر دیکھ کر آئیں تو ہم سے
بولیں "اے بیٹے، وہ موا ہاتھی تو دیو تھا - دیو تھا-
مجھے دیکھ کر موئے نے سونڈ جو اٹھائی اٹھائی تو
میرا کلیجا دھک سے رہ گیا - رہ گیا -"

خالہ سے تو ہم کچھ کہتے نہیں تھے - بزرگ تھیں
اور بزرگوں سے مذاق کرنا سخت بدتمیزی ہے -
ہاں سیما کو چھیڑا کرتے "بی سیما کیا کر رہی ہو، کر
رہی ہو - چلو کیرم کھیلیں - کھیلیں -" سیما بے چاری
جل بھن کر راکھ ہو جاتی - دونوں آنکھیں بھینچ لیتی-
اور ننھا منا ہاتھ آگے نکال کر کہتی -

"اے امی، کتنی دفعہ آپ سے کہا ہے - ایک بات
کو دو دفعہ نہ کہا کرو - لوگ ہنستے ہیں -"

خالہ بے چاری، بھولی بھالی، ٹھوڑی پہ اُنگلی رکھ کر بڑے بھولے پن سے کہتیں "اے بیٹی، ہوش کی دوا کر۔ دوا کر۔ میں کب کہتی ہوں۔ کہتی ہوں۔" ہم دونوں ہاتھوں سے مُنھ دبا کر ہنسی روکتے اور سیما "ہائے اللہ" کہہ کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔

تو وہ قِصّہ کہاں سے چھوڑا تھا ہم نے؟ ...... ہاں یاد آیا — تو بھئی سیما گئی خالہ شمسو کو بُلانے اور تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ خالہ جان سر پر تولیہ لپیٹے، سلیپر گھسیٹتی چلی آ رہی ہیں۔ آتے ہی بولیں "اے آپا، خیر تو ہے؟ ...... اس لڑکی نے تو میرا دِل دہلا دیا۔ دہلا دیا۔"

آبا جان بولے "بات یہ ہے بی شمسو کہ پرسوں سعید کی سالگرہ ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اِس سال ہم لوگ یہ سال گرہ شہر سے باہر کسی باغ میں منائیں گے۔ مُنیر موٹر لے آئے گا۔ ساون کا مہینا ہے، اس بہانے سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔ تُمھاری کیا رائے ہے؟"

خالہ بولیں "اے لو۔ نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ پُوچھ پُوچھ" خدا جانے یہ دو دِن کیسے کٹے۔ اتوار کے دِن صبح ہی صبح مُنیر بھائی جان موٹر لے آئے اور ابّا، امّی، خالہ جان، بھابی جان، سیما اور ہم موٹر میں بیٹھ کر باغ میں پہنچ گئے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں جھُوم رہی تھیں۔ کبھی بجلی چمکتی کبھی گڑ گڑ بادل گرجتا اور کبھی ہلکی ہلکی پھُوار پڑنے لگتی۔ آبا جان ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بھابی جان نے اسٹو جلا کر کڑھائی میں گھی ڈالا۔ میٹھی اور نمکین چیزیں گھر ہی سے بنا لائے تھے۔ صرف پُوریاں کچّی تھیں۔ امّی اور سیما میدے کے پیڑے بناتی جاتیں اور خالہ جان پُوریاں بیل کر بھابی جان کو دیتی جاتیں۔ ہم نے تھوڑا سا میدا لے کر ہاتھی گھوڑے بنانے شروع کر دیے ایک دم سیما نے جھپٹّا مار کر میدا ہمارے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی "اب آپ دُودھ پیتے بچّے تو نہیں ہیں کہ ایسے کھیل کھیلیں۔ ماشاءاللہ 13 سال کے ہو گئے ہیں۔"

ہمیں بڑا غصّہ آیا۔ تن فن کر بولے "اسے سمجھا لیجیے
خالہ جان۔ ایمان سے، میرا غصّہ بہُت خراب ہے۔
احسان فراموش کہیں کی۔"
امّی ہنس کر بولیں "اے بیٹے، تُو نے اس پر
کون سا احسان کیا ہے۔ ذرا میں بھی تو سُنوں؟"
ہم بولے "امّی، میں روز اسے سائیکل پر سکُول
چھوڑنے جاتا ہوں۔"
امّی بولیں "اے بیٹے جاتا ہے تو کیا ہُوا۔ آخر
تیری بہن ہے۔ غیر تھوڑی ہے۔"
ہم بولے "امّی یہ راستے بھر میرے گھونسے مارتی
جاتی ہے۔ چڑیل کہیں کی۔"
خالہ جان ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر بولیں "اے بیٹی
شاباش ہے۔ ایک تو وہ تجھے سائیکل
پر بٹھا کر سکُول لے جاتا ہے، اُوپر سے تُو اس
کے گھونسے مارتی ہے۔ مارتی ہے۔"
سیما تڑخ کر بولی "امّی آپ کو پتا نہیں یہ کتنا
شیطان ہے۔ اتنی تیز سائیکل چلاتا ہے کہ مجھے ہَول

آتا ہے۔ کلیجا دھک کرنے لگتا ہے میرا۔"
"اماں لاحَولَ ولا قُوۃ۔" ابّا جان اُٹھ کر بیٹھ گئے "جس
محفل میں یہ سعید صاحب اور بی سیما جمع ہو جائیں
گے سارا مزا کِرکرا کر دیں گے۔"
ہم بولے "ابّا جان، دیکھیے میں کچھ کہتا ہُوں۔ یہی
میرے ساتھ لڑتی ہے۔"
سیما چمک کر بولی "ہاں میں ہی لڑتی ہُوں۔ آپ
تو جیسے بہت شریف ہیں۔ آج سے میرے ساتھ
بات مت کرنا۔"
"کون کرتا ہے تُمھارے ساتھ بات۔ ہم نے مُنھ
چڑا کر کہا "آج سے بول چال ختم۔ کُٹّی۔ کُٹّی۔ چھُو۔"
سیما نے میدا طباق میں پٹک دیا اور مُنھ پھُلا کر
بیٹھ گئی۔ ابّا جان بولے "توبہ ہے بھئی، اماں مُنیر
میاں۔ تُم ہی اس محفل کو گرماؤ گے۔ کوئی برساتی
گیت سُناؤ۔ تُم تو بہُت اچھے شاعر ہو۔"
مُنیر بھائی شرمانے لگے تو ابّا جان بولے "اوہو،
اپنے ابّا کے سامنے گاتے ہُوئے شرم آتی ہے۔ اچھا

چلو بھئی ہم تمھیں ایک گیت سُناتے ہیں ۔" یہ کہہ کر
ابّا جان نے گلا صاف کیا اور دِھیمے دِھیمے سُروں
میں گانے لگے ؎

مینہ کی لگی جھڑی ہے رے دِن رات برسے پانی
ساون کی رُت سُہانی

اُدھر سے امّی جان نے تان اُڑائی ؎

جھُولے پڑے ہیں باغوں میں ، برکھا برس رہی ہے
چھم چھم برس رہی ہے
بھیّا سے کہیو لائیں وہ چُندری رنگا کے دھانی
ساون کی رُت سُہانی

ابّا جان بولے " واہ وا ، غضب کر دیا ۔ کیا شعر
کہا ہے ۔ مگر بھئی یہ سیما کے مُنھ سے اچھّا لگے گا ۔
بیٹی سیما ذرا سُنانا تو ۔"

سیما کا مُنھ پھُول کر کپّا ہو گیا تھا ۔ اس نے
غُصّے بھری نظروں سے ہمیں دیکھا ، سر کو ہلکا سا
جھٹکا دیا اور مُنھ موڑ کر بیٹھ گئی ۔

خُدا جانے ابّا امّی کے گانے کا اثر تھا یا کیا کہ

ایک دم بجلی زور سے چمکی اور ہولناک گرج کے ساتھ
موُسلا دھار بارش ہونے لگی ۔ کیسی سالگرہ اور کیسا
کھانا پینا ۔ جلدی جلدی سامان سمیٹا اور موٹر کی
طرف بھاگے ۔ بھائی جان ، ابّا جان اور امّی آگے
بیٹھ گئے اور ہم ، سیما ، بھابی جان اور خالہ جان
پیچھے ۔ جگہ کم تھی اس لیے ہم نیچے پیروں میں
بیٹھنے لگے تو خالہ بولیں "اے بیٹا ، میری گود میں
بیٹھ جا ۔ بیٹھ جا ۔" مگر ہم نہیں مانے ۔

موٹر چلی تو ابّا جان امّی سے بولے "کھڑکی بند
کر لو ۔ بوچھاڑ آ رہی ہے ۔ بھیگ جاؤ گی ۔"

بھائی جان نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور
بھابی جان سے بولے "رشیدہ ، تُم بھی کھڑکی بند
کر لو ۔ تُمھیں پہلے ہی زکام کی شکایت ہے ۔"

سیما مُسکرا کر ہم سے بولی "اب تُم تھک گئے
ہو گئے ۔ لو میری جگہ بیٹھ جاؤ ۔ میں نیچے بیٹھے
جاتی ہوں ۔" ہم تو بہانہ ڈھونڈ رہے تھے ۔ جھٹ
اُچک کر خالہ کی برابر بیٹھ گئے ۔ ابّا جان ہنس کر

بولے "ارے بھئی بہن بھائیوں میں صُلح ہو گئی۔ مُبارک ہو۔ چلو اِسی خوشی میں چلم بھر لاؤ۔"

امّی جان بولیں "اے سٹھیا گئے ہو۔ یہاں موئی چلم کہاں دھری ہے؟"

خالہ جان گم سُم بیٹھی برستے ہوئے بادلوں کو تک رہی تھیں۔ ہم نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار سے بولے "خالہ جان، کھڑکی بند کر دیجیے۔ خُدا نخواستہ، شیطان کے کان بہرے، آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر مجھے ایسی خالہ کہاں ملے گی۔ کہاں ملے گی۔"

خالہ جان کا چہرہ گُلاب کے پھُول کی طرح کھِل اُٹھا۔ ہنس کر بولیں "چل ہٹ مکّار۔ باتیں بنانا تو کوئی تجھ سے سیکھے۔ تجھ سے سیکھے۔"

اجی، لشتم پشتم واہ وا

جب ہم ساتویں جماعت میں فسٹ ڈویژن پاس ہوئے تو صاحب بس پُوچھو مت۔ دُنیا بھر کی خوشیاں ہمارے گھر میں سمٹ آئیں۔ ابّا جان اپنی گھنی مونچھوں میں ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مُسکراہٹ چھُپانے کی لاکھ کوشش کرتے مگر موتیوں جیسے صاف اور چمک دار دانت تھے کہ نکلے پڑتے تھے۔ امّی جان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ایک تو تھیں ہی سُرخ سفید کہ ہاتھ لگائے میلی ہوں۔ اِس پر خوشی کی لالی بس چہرے پر شفق پھُوٹی پڑتی تھی۔

ہم سب دالان میں بیٹھے تھے۔ امّی، ابّا، ہم اور

ہماری خالہ زاد بہن بیما۔ شرارت میں ہم سیر تو وہ خیر
سے سوا سیر۔ بُوا کریمن نے چلم بھر کر حُقّے پر رکھ
دی۔ ابّا جان نے پہلا کش ہی لگایا تھا کہ امّی ہاتھ
سے ناک دبا کر بولیں "توبہ۔ ناک سڑا دی تُم نے تو
یہ مُوا حُقّہ کبھی پیچھا بھی چھوڑے گا ؟ ہر وقت گڑگڑ گڑ گڑ
دن بھر کھوں کھوں کھوں۔ بڑوں ہی کی دیکھا دیکھی
بچّے بُری عادتیں سیکھتے ہیں۔ میرا بس چلے تو اِن
مُوئے حُقّوں کا حُقّہ پانی بند کر دوں —— ہاں تو——
میں کہہ رہی تھی کہ بیٹا، خیر سے، اِمتحان میں پاس
ہُوا ہے اور نہ کوئی مٹھائی نہ خوشی۔ دُنیا سُنے گی تو کیا

کہے گی ؟"

ابّا جان بولے "آج کوئی نرالا تھوڑی پاس ہُوا
ہے۔ پہلے بھی تو پاس ہی ہوتا رہا ہے ماشاءاللہ"

امّی ہاتھ ہلا کر بولیں "پاس تو ہوتا رہا ہے مگر
پھسٹ ڈیزن کبھی پاس نہیں ہُوا——"

پھسٹ ڈیزن سُن کر ہماری تو ہنسی نکل گئی۔ بیما
نے مُنھ میں دوپٹّا ٹھونس لیا اور ابّا جان مُسکرا کر
بولے "پھسٹ ڈیزن نہیں۔ خُدا کی بندی فسٹ ڈویژن"

امّی بولیں "اے وہ پھسٹ ہو کہ فسٹ۔ میں نے
کون سا مِڈل پاس کیا ہے۔ مجھے کیا پتا مُوا پھسٹ
ہوتا ہے کہ فسٹ۔"

ابّا جان بولے "مڈل پاس کیا ہوتا تو آج یہ بچّے
کاہے کو ہنستے۔ آج ہی کتاب منگا لو۔ سعید سے دو
حرف روز پڑھ لیا کرنا۔"

امّی ہنس کر بولیں "اے خاک ڈالو۔ اب بُڑھاپے
میں گِٹ پٹ کرنے بیٹھوں گی۔ ہاں تو میں کہہ رہی
تھی کہ خُدا نے یہ خوشی کا موقع دیا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی

دعوت کر ہی ڈالو۔ اسی بہانے چار پیارے عزیز
اکٹھے ہو جائیں گے۔"

ابّا جان بولے "اچھا بھئی اچھا۔ کل شام سب کو
بُلا لو۔ کھانے کے بعد قوّالی بھی ہو گی۔ جھنڈے خاں
مُنڈے خاں قوّالوں کو بُلا لیں گے۔"

ہم تالیاں بجا کر بولے "آہا ہا ہا۔" پیما خوشی سے
ناچنے لگی۔

امّی بولیں۔ "تو میں کریمن کے ہاتھ سب کو
بُلاوا بھیجے دیتی ہوں۔"

برسات کے دن تھے مگر آسمان بالکل صاف تھا۔
کمرے چھوٹے چھوٹے سے تھے، اِس لیے صحن میں
شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد تمام لوگ
قرینے سے بیٹھ گئے تو جھنڈے خاں مُنڈے خاں
نے ہارمونیم اور طبلے نکالے۔ ہمیں کہیں اور جگہ نہ
ملی تو ہم نے کونے میں نارنگی کے پیڑ تلے ڈیرا لگا
دیا۔ ہمارا لنگوٹیا یار سرمد بھی ہمارے ساتھ تھا۔

اس جگہ بالکل اندھیرا تھا۔ ہم تو سب کو دیکھ سکتے
تھے مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں سے
قوّالوں تک کا فاصلہ مُشکل سے آٹھ دس گز ہو گا۔

ایک تو جھنڈے خاں مُنڈے خاں کی صُورت
ہی منحُوس تھی، دُوسرے اُنھوں نے جو گانا شرُوع
کیا وہ فارسی کا تھا۔ ہمارے خاک بھی پلّے نہ پڑا۔
پھر مُصیبت یہ کہ ایک ایک شعر کو دس دس بار گنتے۔
شور زیادہ مچاتے اور گاتے کم۔

ان میں ایک بُڈّھا طبلچی بھی تھا۔ اس نے اِتنی
زور سے طبلے پر ہاتھ مارا کہ ہم اُچھل پڑے۔
جھنڈے خاں کانوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخے۔
"اجی لشتم کے پشتم۔"

مُنڈے خان جھوم کر دہاڑے "اجی واہ وا۔"

جھنڈے خان پھر زور سے ڈکرائے "اجی لشتم
کے پشتم۔"

اور تمام قوّال کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے:
"اجی واہ وا۔"

غرض آدھ گھنٹے تک وہ یہی لشتم پشتم کرتے رہے۔ ہم تنگ آکر بولے "یار سرمد، یہ تو سخت نامعقول قوال ہیں۔"

سرمد منہ چلاتے ہوئے بولا "میرا بس چلے تو ان کے حلق میں کپڑا ٹھونس دوں۔"

ہم نے پوچھا "یہ تو کیا کھا رہا ہے؟"

بولا "الائچی دانے ۔۔" اور یہ کہہ کر اس نے تھوڑے سے ہمیں بھی دے دیے۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ گول گول۔

یکایک ہمیں شرارت سوجھی۔ بڑی انوکھی اور دل چسپ۔ دل مارے خوشی کے دھک دھک کرنے لگا۔ ہم نے ایک الائچی دانہ انگلی کے ناخون پر رکھا اور اسے انگوٹھے سے دبا لیا۔ جوں ہی ایک قوال نے "آ آ آ" کرکے منہ پھاڑا ۔۔ ہم نے الائچی دانہ پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ الائچی دانہ انگلیوں میں سے ایسے نکلا جیسے کمان سے تیر اور سیدھا اس قوال کے حلق میں گھس گیا۔

وہ بے چارہ خپ خپ خپ کرتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جھنڈے خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر آنکھیں میچ کر، حلق پھاڑ کر زور سے تان اڑائی "آآآآآ۔"

ہم نے دوسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور جب جھنڈے خاں نے آآآ کرتے ہوئے ہماری طرف منہ کیا تو ہم نے ایک دم انگلی چھوڑ دی۔ نشانے کے ہم پکے تھے۔ الائچی دانہ سن سے انگلیوں میں سے نکلا اور جھنڈے خاں کے منہ میں گھس گیا۔ وہ بے چارے بھی خپ خپ کرنے لگے۔

انھیں دیکھ کر طبلے والے بڈھے نے گلا صاف کیا اور لگا منہ پھاڑنے۔ ہم نے تیسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور انگوٹھے سے دبا کر اسے چھوڑنا چاہتے ہی تھے کہ ایک دم پیچھے سے آکر کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سیما تھی۔

"س س سیما۔ ت ت تم۔" ہماری زبان لڑکھڑا گئی اور خون رگوں میں دوڑتے دوڑتے ایک دم رک گیا۔

آہستہ سے بولی " ذرا
اِدھر تشریف لایئے ۔
اُٹھیے ۔ جلدی کیجیے ۔
وہ آگے آگے اور
ہم پیچھے پیچھے ۔ صحن پار
کر کے کمرے میں پہنچے تو دھیرے سے بولی
" تو یہ آپ تھے ۔ کیوں ؟ اگر میں خالو جان سے
کہہ دوں تو ؟ "

ہم گھبرا کر بولے " تو ریما بہن یہ جو چند بال تمھیں
میری کھوپڑی پر نظر آ رہے ہیں اُنھیں ابّا جان کا
جُوتا اِس طرح دُھن کر رکھ دے گا جس طرح خیر دین
دُھنیے نے دادی امّاں کے پُرانے لحاف کی رُوئی
دُھن کر رکھ دی تھی ـــــ تمھیں یاد ہے ، ریما
ب ب ب بہن ؟ "

ریما مُسکرا کر بولی " ہاں یاد ہے مگر بہت دنوں
کے بعد آج بدلہ لینے کا موقع مِلا ہے ۔ گِن گِن
کے بدلے لوں گی ۔ "

ہم آنکھوں میں آنسو بھر کے بولے " ریما بہن
معاف کر دو ۔ خدا آپ کو معاف کر دے گا ۔
قرآن شریف میں اللہ میاں نے فرمایا ہے کہ جو
شخص کِسی کا ایک عیب چھپاتا ہے ، اللہ تعالیٰ
اس کے ستّر عیب چھپاتا ہے ۔ ستّر یا اکہتّر یا
شاید بہتّر ۔ ٹھیک یاد نہیں ۔ ابّا جان کو معلوم ہے ۔ "

بولی " ہم تمھاری طرح چُغل خور نہیں ۔ ہم تمھیں
معاف کرتے ہیں مگر ایک شرط پر ـــ وعدہ کرو
کہ ہمیں روز اِملیاں لا کر دیا کرو گے ۔ خُوب
کھٹّی کھٹّی ۔ "

ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا " میں وعدہ کرتا ہُوں
ریما بہن ۔ روز آپ کو اِملیاں لا کر دیا کروں گا ۔
آپ کے حساب کے سوال بھی کر دیا کروں گا ۔
عید بقر عید پر پیسے مِلیں گے تو وہ بھی آپ
کو دے دیا کروں گا اور ریما بہن ـــ جب میں
بڑا ہو جاؤں گا تو راوی کے کنارے آپ کے لیے
ایک شان دار محل بنواؤں گا اور اس میں کھٹّی اِملیوں

کا ایک عالی شان باغ لگایا جائے گا۔ ہر درخت
کے نیچے آم کے اچار کے مٹکے رکھے ہوں گے۔"
ریما کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ ہونٹوں پر
زبان پھیرنے لگی۔
ہم بولے "تو۔ اب میں جاؤں ریما بہن پیاری
بہن۔ ننھی بہن ؟۔"
بولی "ذرا ٹھہریے۔ تھوڑی سی سزا آپ کو ملنی ہی
چاہیے۔ بس ذرا سی۔"
یہ کہہ کر اس نے سیدھا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے
رکھا۔ سیدھے ہاتھ کی کہنی تلے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی
رکھی اور اس طرح جھومی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔
پھر ایک دم ڈانٹ کر بولی "کان پکڑو۔"
ہم نے جھٹ کان پکڑ لیے۔ کیا کرتے۔
بولی "مرغا بنو۔"
ہم فوراً مرغا بن گئے۔
بولی "ناک سے زمین پر لکیر کھینچو۔ لمبی سی۔"
ہم ایک دم سجدے میں گر پڑے اور ناک سے

ایک گز لمبی لکیر زمین پر کھینچ دی۔
بولی "ٹھیک ہے۔ بس اب جاؤ۔"
کیسی قوالی اور کہاں کا گانا۔ جلدی سے کمرے
میں گھسے اور چٹخنی لگا کر سو گئے۔

صبح اتوار تھی۔ خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔
آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ دو تین انگڑائیاں لیں
سلیپر پہنے اور غسل خانے کی طرف چلے۔ راستے میں
ابا جان کا کمرہ تھا۔ جب ہم کمرے کے پاس سے
گزرے تو اندر سے آواز آئی "سعید صاحب۔۔۔۔"
۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔
قدم نہ آگے اٹھتے تھے نہ پیچھے۔ اتنے میں پھر
آواز آئی "سعید صاحب! سنا نہیں آپ نے؟"
ہم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی مشکل سے
اٹک اٹک کر بولے "اب اب آبان، آپ
نے مجھے بلایا؟"
آواز آئی "جی ہاں۔ میں نے ہی آپ کو بلایا ہے۔"

ذرا اندر تشریف لائیے۔"

ڈرتے ڈرتے، لرزتے، کانپتے اندر گئے۔ ابا جان کے چہرے کے سامنے اخبار تھا۔ انھوں نے اخبار کا ورق اُلٹا اور بولے "یہ رات آپ نے کیا حرکت کی تھی میاں صاحب زادے؟"

ہمارا یہ حال کہ کاٹو تو لہُو نہیں بدن میں۔ سوچتے تھے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم سما جائیں۔ چُپ چاپ سر جھکائے کھڑے رہے۔

ابّا جان نے اخبار میز پر رکھ دیا اور عینک ماتھے پر کر کے بولے "بیٹا، تُم نے سمجھا کہ تُم جو کچھ کر رہے ہو وہ مذاق ہے۔ مگر ناسمجھی میں تُم یہ نہ سمجھ سکے کہ بعض مذاق بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ فرض کرو، تمھارا الائچی دانہ مُنھ میں جانے کے بجائے قوال کی آنکھ میں لگ جاتا تو اُس کی آنکھ پھوٹ جاتی۔ تمھارا تو مذاق ہو جاتا اور اس غریب کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھ سے ہاتھ دھونا پڑتے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے کو جھکے اور ایک ایک لفظ

تول تول کر بولے "بیٹا، جو بچّہ شرارت نہ کرے تو وہ بچّہ نہیں ہوتا۔ فرشتہ یا ولی اللہ ہوتا ہے۔ مگر — ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسی شرارت جس سے دُوسروں کو نُقصان پہنچے یا اُن کا دِل دُکھے شرارت نہیں شیطانی ہے اور شیطانی کرنا شیطان کا کام ہے۔ اِنسان کا نہیں —"

ہم شرمندہ ہو کر بولے "ابّا جان، اصل میں شیطان نے مجھے بہکا دیا تھا۔"

بولے "ہاں ہاں۔ ہم بھی یہی سمجھتے تھے۔ بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ تُم جیسا سمجھ دار اور عقل مند بچّہ ایسی ناسمجھی کی باتیں کرے۔ ہمیں اُمّید ہے کہ آیندہ تُم ایسی بُری حرکت نہیں کرو گے۔"

ہم جلدی سے بولے "میں وعدہ کرتا ہُوں ابّا جان۔"

خوش ہو کر بولے "شاباش، جیتے رہو۔ اب جاؤ۔ جا کر نہاؤ۔ ناشتا کرو پھر ہمارے پاس آنا۔ کیرم کھیلیں گے۔ سِما کو بھی لیتے آنا۔"

ہم مُنھ لٹکائے باہر نکلے۔ دالان میں سیما دوپٹّا
مُنھ میں ٹھُونسے کھڑی ہنس رہی تھی۔ ہمارے تن بدن
میں آگ لگ گئی۔ مُٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر
آگے بڑھے تو بولی "خالو جان۔ دیکھیے دیکھیے۔۔۔"

لو سُنو کہانی

دُنیا میں سیکڑوں بیماریاں ہیں۔ کھانسی، نزلہ، زُکام
بُخار، توبہ۔ کوئی کہاں تک نام گِنائے۔ مگر ایک بیماری
سب سے زیادہ خطرناک ہے اور وہ ہے "کہانیاں لکھنا"۔
ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض جس بچّے کو لگ جائے تو
سمجھ لو کہ وہ گیا کام سے۔ پھر وہ نہ دین کا رہتا
ہے اور نہ دُنیا کا۔

ہماری سُنیئے۔ ہمیں یہ مرض اُس وقت لگا تھا،
جب ہم چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ پڑھنے لکھنے
کے ہم دھنی تھے۔ سکوُل کے کام سے فُرصت ملتی تو
بچّوں کے تمام رسالے اور کتابیں پڑھ ڈالتے۔ چھٹیاں

ہوتیں تو ابا جان کی موٹی موٹی، دیمک کھائی ہوئی
کتابیں بھی نہ چھوڑتے۔ چاہے سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں
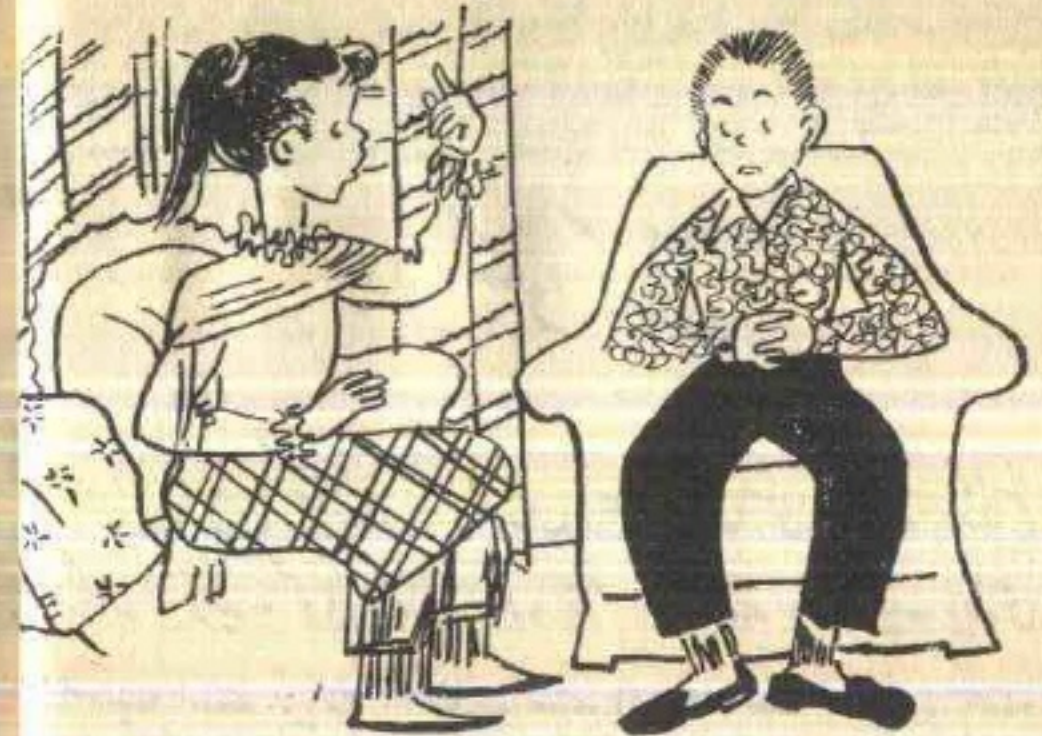
ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ لاؤ ہم بھی ا
کہانی لکھیں۔ چناں چہ کئی دن کی محنت کے بعد
کہانی لکھی۔ سوچا پہلے ابا امی کو سنا دیں۔ اگر انھو
نے کہا کہ اچھی ہے تو پھر اسے کسی رسالے میں
چھپنے کے لیے بھیج دیں گے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ امی باورچی خانے میں
بیٹھی پکوڑے تل رہی تھیں۔ ہم نے پاس جا کر ک

"امی۔ امی جان۔ امی پیاری۔"

بولیں "چلو چلو۔ ابھی مت آؤ۔ سب کے ساتھ کھانا۔ ابھی تو چائے بھی نہیں بنی۔"

ہم بولے "ہم کوئی پکوڑے کھانے نہیں آئے ہیں امی! ہم نے ایک کہانی لکھی ہے۔ سنائیں؟"

بولیں "سناؤ بیٹے۔۔۔" ہم نے حلق صاف کیا اور بولے "ایک تھی شہزادی۔۔۔"

ہنس کے بولیں "ماں صدقے بیٹے۔ کسی نوراں یا خیراں کا نام لے۔ شہزادیاں تو بہت اونچے محلوں میں رہتی ہیں۔ وہاں تک میری پہنچ کیسے ہو گی؟"

ہم مچل کر بولے "امی، آپ تو ہر وقت مذاق کرتی ہیں۔ ہم سر پھوڑ لیں گے اپنا۔ جائیے ہم نہیں سناتے۔ ہم ابا جان کو سنائیں گے۔"

ابا جان برآمدے میں بیٹھے دفتر کا کام کر رہے تھے۔ "اٹھارہ بیس اٹھائیس۔ اٹھائیس دو تیس۔ تیس دو بتیس۔ بتیس بتیس بتیس۔۔۔"

ہم نے بڑے پیار سے کہا "ابا جان، اتنا کام نہ کیجیے۔ آپ کے دماغ پر زور پڑے گا۔"

چونک کر بولے "زور پڑے گا؟ کس پر زور پڑے گا؟"

"ابو آپ کے دماغ پر زور پڑے گا۔" ہم نے جھلا کر کہا۔

بولے "میرے دماغ پر زور پڑے گا؟ کس کا زور پڑے گا؟ تیس دو بتیس۔ بتیس۔ بتیس۔ بتی۔ بتی بتی اگر بتی۔ موم بتی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بیٹے جاؤ۔ سیما کے ساتھ کھیلو۔ تم نے سب کچھ بھلا دیا۔"

ہم نے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولے "ابو کام پھر کر لینا۔ پہلے ہماری کہانی سن لیجیے۔ ایک تھی شہزادی؟ ۔ ۔ ۔"

بولے "شہزادی؟ کون سی شہزادی؟"

"شہزادی کون سی ہوتی ہے؟" ہم جھنجلا کر بولے۔

ہنس کے بولے "شہزادی دیکھی ہے کبھی تم نے؟"

"نہیں تو ——" ہم نے سر ہلایا۔

بولے "پھر —— ایسی چیز کے متعلق تم کیا لکھو گے جسے تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں؟ اگر لکھو گے تو وہ جھوٹ ہو گا۔ حقیقت کے خلاف ہو گا۔ تیس دو بتیس۔ بتیس چار چھتیس۔ چھتیس دو اڑتیس۔ ۔ ۔"

ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوچا، چلو سیما کو سنائیں۔ سیما کمرے میں بیٹھی سکول کا کام کر رہی تھی۔ ہم جا کر تمیز سے بیٹھ گئے۔ اس نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور بڑی بے رخی سے بولی:

"فرمائیے! کیسے تشریف لائے؟ کوئی نئی شرارت سوجھی ہے؟ ہاتھ دکھائیے کوئی مینڈک وینڈک تو نہیں؟"

ہم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولے "سیما بہن! اب میں نے شرارت سے بالکل توبہ کر لی ہے۔ کل کو نہا کر پانچوں وقت کی نماز پڑھوں گا۔"

بولی "بڑے نیک۔ بڑے پارسا۔ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ جب دس ہزار شیطان مرے تھے

تو آپ پیدا ہُوئے تھے ۔ کل رات خُدا جانے کہاں
سے لا کر میری چارپائی میں کھٹمل چھوڑ دیئے ۔ رات
بھر نیند نہیں آئی ۔"

"آئی ایم سوری" ہم جلدی سے بولے "بات یہ تھی
سیما بہن کہ میری چارپائی میں پانچ کھٹمل تھے ۔ ایک
بے چارہ بہت دُبلا پتلا تھا ۔ اسے میں نے آپ کی
چارپائی میں چھوڑ دیا ۔ اُس نے آپ کو کاٹا تھا سیما
بہن ؟"

"کھٹمل کاٹتے نہیں ہیں تو کیا پیار کرتے ہیں ؟"
وہ مُنہ چڑا کر بولی "ساری رات کھُجاتے کھُجاتے گزُر
گئی ۔ پلک سے پلک نہیں لگی ۔ چارپائی کوُٹتے کوُٹتے
ہاتھوں میں درد ہونے لگا ۔"

"آئی ایم سوری ۔ ویری سوری سیما بہن ۔" ہم بولے
"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف
ہُوئی ۔ خُدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے ۔"

بولی "خُدا خیر کرے ۔ آج بہت بھولی بھولی باتیں
کر رہے ہیں ۔ کوئی خاص مطلب ہو گا ۔ کچھ اُدھار

مانگنے آئے ہوں گے ؟" میرے پاس پھُوٹی کوڑی بھی
نہیں ۔ پچھلے ہفتے آپ نے مجھ سے چار آنے لیے تھے ۔
ایک دِن کا وعدہ کیا تھا ۔ ابھی تک واپس نہیں کیے ۔
دُنیا بھر کے بھائی، بہنوں کو دیتے ہیں ۔ آپ کچھ انوکھے
ہی بھائی ہیں کہ اُلٹا بہنوں کو لوُٹ لوُٹ کر کھاتے
ہیں ۔"

"آئی ایم سوری ۔" ہم گردن جھُکا کر بولے "کل
ابا جان جیب خرچ دیں گے تو میں آپ کی کوڑی
کوڑی لوٹا دوں گا ۔"

بولی "کل بھی دُور نہیں ۔ دیکھ لیں گے ۔ مگر کل سے
پرسوں ہُوئی تو پھر یہ بات خالو جان کے کانوں تک
پہنچانا پڑے گی اور پھر آپ "آئی ایم سوری" کہنا ہمیشہ
کے لیے بھُول جائیں گے ۔ اچھا ۔ اب جلدی سے
فرمایئے کیا بات ہے ۔ مجھے سکول کا کام کرنا ہے ۔"

ہم نے جیب سے کاغذ نکالا اور بولے "سیما بہن!
میں نے ایک کہانی لکھی ہے ۔ بڑی مزے دار ۔
سُنو ۔ ایک تھی شہزادی ۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بولی "شہزادی؟ —— ارے ہاں!
ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی آپ کو۔ رات میں
نے ایک خواب دیکھا تھا بڑا اچھا!" یہ کہہ کر اس
نے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھی اور آنکھیں میچ کر بولی:
"کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نہایت شان دار باغ ہے۔
طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ باغ کے بیچوں بیچ
ہیرے جواہرات کا ایک تخت رکھا ہے۔ اس تخت
پر ایک شہزادی بیٹھی ہے۔ چندے آفتاب۔ چندے
ماہتاب۔ ماتھے پے چاند۔ ٹھوڑی پے تارا۔ جانتے
ہو وہ شہزادی کون تھی —— ؟"

"کون تھی —— ؟" ہم نے جلدی سے پوچھا۔

اُس نے ہاتھ گھما کر اُنگلی سینے پر رکھی اور بولی۔

"میں اور کون —— ؟"

"ہت تیرے کی" ہم بولے "پھر کیا ہُوا —— ؟"

بولی "اتنے میں نقّارے پر چوٹ پڑی۔ کڑھم دھم۔
کڑھم دھم۔ دربانوں نے زور سے پکارا "باادب۔ باملاحظہ۔
ہوشیار"۔ سارا باغ نور سے جگمگا اُٹھا۔ آسمان سے

جگ مگ جگ مگ کرتا ایک اُڑن کھٹولا اُترا۔ اس
کھٹولے پر ایک بادشاہ بیٹھا تھا۔ جانتے ہو وہ بادشاہ
کون تھا؟"

ہم نے ہاتھ گھما کر اُنگلی سینے پر رکھی اور بولے
"میں —— اور کون؟ ——"

"دھت" وہ ہاتھ جھٹک کر بولی "صورت دیکھی
ہے آئینے میں؟ ارے وہ تو پرستان کا بادشاہ تھا۔
اس نے کہا 'ننھی شہزادی! آؤ میرے اُڑن کھٹولے پر
بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں پرستان کی سیر کراؤں گا۔ میں جھٹ
کھٹولے پر بیٹھ گئی اور کھٹولا اُڑنے لگا ——"

"آئی ایم سوری" ہم گھبرا کر بولے "خالہ جان کہاں
تھیں —— ؟"

"امّی —— ؟ امّی بھی وہیں تھیں باغ میں۔"

"جُوتے پہنے تھیں —— ؟" ہم نے پوچھا

"ہاں! پہنے تھیں۔ کیوں —— ؟"

"تعجّب ہے! —— پھر کیا ہُوا؟"

"پھر —— ؟" وہ سوچتے ہُوئے بولی "کھٹولا اُڑتا چلا جا

رہا تھا کہ ـــــ ایکا ایکی اس کم بخت کھٹمل نے اتنی زور
سے کاٹا کہ ہماری آنکھ کھل گئی۔ خدا آپ کو سمجھے گا۔
ہم تو کچھ نہیں کہتے۔ اچھا اب جائیے۔ مجھے کام کرنا
ہے۔ نہیں تو اُستانی خفا ہوں گی۔"

ہم بولے "مگر سیما بہن۔ وہ کہانی تو یوں ہی رہ گئی۔"

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "ہم نہیں سنتے۔ نہیں
سنتے۔ ہائے اللہ ہم رو دیں گے۔ دیکھیے خالو جان
یہ بھائی جان نہیں مانتے۔ اللہ میرے کیا کروں۔"

ہم نے مٹھی بھینچ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی
اور دانت کٹکٹا کے بولے "اب کبھی مجھ سے بات
نہ کرنا۔ آج سے تو نہ میری بہن نہ میں تیرا بھائی۔
آئی ایم سوری۔"

تن فن ہو کر باہر نکلے۔ برآمدے میں آئے تو چائے
لگ چکی تھی۔ امّی بولیں "آؤ بیٹے چائے پیو۔ سیما تو
بھی آ۔ اپنی امّی کو بھی بلا لے۔"

ہم ابّا جان کے برابر بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے
ہمارے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گال تھپتھپائے اور بولے

"بیٹے تم ہم سے خفا ہو ـــــ ؟"

ہم منھ لٹکا کر بولے "جی نہیں ـ سوری!"

بولے "بیٹا! تم کس جھنجھٹ میں پڑے ہو۔ یہ
عمر تعلیم حاصل کرنے کی ہے۔ ابھی تم میں اِتنی سمجھ
کہاں کہ کہانیاں لکھو۔ جب پڑھ لکھ کر قابل ہو جاؤ
تو پھر کہانیاں چھوڑ ناول لکھا کرنا۔ ویسے کہانیاں
لکھنا کوئی اِتنی اچھّی بات نہیں ـــ" اُنھوں نے پکوڑا
منھ میں رکھّا اور بولے "ہمارا ملک سائنس اور صنعت
میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہمارے ملک کو
سائنس دانوں، انجینئروں اور کاریگروں کی ضرورت ہے۔
نکمّے اور کام چور کہانی لکھنے والوں کی نہیں۔ میں
سوچتا ہوں میرا بیٹا پڑھ لکھ کر یہ بنے گا اور وہ
بنے گا۔ مگر ـــ تم نے تو کہانیاں لکھنا شروع
کر دیں۔ اب پڑھو گے کیا۔"

ہم نے جیب سے کہانی نکال کر پھاڑ ڈالی
اور سیما سے بولے "سیما بہن! یہ لو۔ یہ میرے
جگر کے ٹکڑے ہیں۔ انھیں چولھے میں ڈال دو۔"

سیما بولی: "بہت اچھا سعید بھائی۔ مگر آپ
نے یہ جو دو پکوڑے، نظر بچا کر، جیب میں
رکھ لیے ہیں اِنھیں واپس پلیٹ میں رکھ دیجیے۔
آئی ایم سوری!"

نانی ٹھنّو

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی، پر بُوند ابھی نہیں
پڑی تھی۔ ہمارے گھر زنانہ میلاد شریف تھا اور
مُلّانیاں ابھی تھوڑی دیر ہُوئی مولُود پڑھ کے گئی تھیں۔
جو رِشتے کی عورتیں دُور محلّے کی تھیں، اُنھیں امّی
نے روک لیا تھا کہ بہن! اس وقت کہاں جاؤ گی؟
نہ رکشا نہ تانگا اور پھر مینہ کا ہر دم دھڑکا۔ صُبح
کو چلی جانا۔

آسمان پر بادل گرج رہے تھے اور بجلی ایسی
لپکیں مار رہی تھی کہ زمین سے لگ لگ جاتی
تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں بارش نہ آ جائے، چارپائیاں

برآمدے میں بچھائی گئی تھیں - بائیں طرف کونے میں
ہمارا پلنگ تھا - ہمارے برابر ہماری خالہ زاد بہن
سیما کا - اُس کے بعد نانی ٹخّو کا اور پھر امّی اور
دُوسری عورتوں کے - اب اِن نانی ٹخّو کا حال سُنو -

یہ نانی ٹخّو سارے شہر کی نانی تھیں - ساٹھ سال
سے زیادہ عُمر ہوگی - مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت -

کمر جُھک کے زمین کو لگ گئی تھی - چلتیں ، تو ایسے
جیسے آٹھ کا ہندسہ لُڑھکتا ہُوا چلا جا رہا ہے - شہر
میں کہیں شادی بیاہ ہو تو نانی ٹخّو سب سے پہلے
موجُود - چاہے جان پہچان ہو یا نہ ہو - لوگ اُنھیں
نانی سیدانی کہتے تھے مگر ہم بچّوں نے اُن کا نام
نانی ٹخّو رکھا تھا -

گیارہ بج چُکے تھے مگر باتوں کی کھچڑی پک رہی
تھی - ایکا ایکی امّی کو کچھ خیال آیا اور وہ ہم سے
بولیں "بیٹا سعید! صُبح کو جا کر اُس موئے ٹال والے
سے کہنا کہ ساری گیلی لکڑیاں ہمارے گھر ہی ڈال
گیا ہے - توبہ آنکھیں پھوٹ گئیں پھونکتے پھونکتے اور
لکڑیاں تھیں کہ جلنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں -"

ہم بولے "امّی! یہ صُحبت خان بڑا لڑاکا آدمی
ہے - لوگ اِسے مُصیبت خان کہتے ہیں - زیادہ تین
پانچ کرو تو کہتا ہے: 'تو بھئی! لکڑی گیلا ہے تو
کیا ہُوا - چُولھے میں جلے گا تو سُوکھ جائے گا -"

"سیما بولی "تو آپ اِس سے لاتے ہی کیوں ہیں؟

دو قدم آگے بڑھ کر دُوسری ٹال سے لے آیا کیجیے۔"

"جی ہاں! زبان ہِلا دینا بہُت آسان ہے اور کرنا بہُت مُشکل۔" ہم نے کہا "آپ ہی سکول سے آتے وقت لیتی آیا کیجیے نا۔"

"لیجیے خالہ جان!" سیما ہاتھ نکال کر بولی "بھلا کہیں لڑکیاں بھی لکڑیاں لاتی ہیں؟"

"جی ہاں! لڑکیاں ہوائی جہاز چلا سکتی ہیں، توپوں اور بندوقوں سے لڑ سکتی ہیں، لکڑیاں کیوں نہیں لا سکتیں؟ — اور پھر لکڑی اور لڑکی میں فرق ہی کتنا ہے — کاف کو لے سے ہِلا دو تو لڑکی بن گئی اور لام سے ہِلا دو تو لکڑی —"

اس پر اِتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ برآمدے کی چھت ہلنے لگی۔ امّی نے۔ بڑے پیار سے ہماری طرف دیکھا اور انجم آپا سے بولیں "بڑا سمجھ دار بچّہ ہے ماشاءاللہ۔ چھٹی جماعت میں فسٹ آیا ہے۔ اپنے آبا سے تو ایسی بحثیں کرتا ہے کہ بے چارے حُقّہ لے کر بیٹھک میں بھاگ جاتے ہیں۔ پر بیٹی! ہے بہُت شریر۔"

انجم آپا بولیں "اے خالہ! تیز دماغ کے بچّے شریر ہُوا ہی کرتے ہیں۔"

"واہ! رٹّا لگا کے فسٹ آئے تو کیا آئے۔" سیما مُنھ بنا کر بولی "اِس طرح تو طوطا بھی فسٹ آ سکتا ہے۔ ایک دِن بڑا مزہ آیا — خالہ جان! ذرا سُنیے۔ آپ کمرے میں بیٹھے جھُوم جھُوم کر جُغرافیہ رٹ رہے تھے — مان سون ہوائیں بارش برماتی ہیں۔ بارش برماتی ہیں —" میں نے کہا "بھائی جان بارش برسانا تو سُنا تھا، یہ برمانا کیا ہُوا؟ بولے 'بکو مت! کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے، میں نے کتاب دیکھی تو واقعی اس میں چھپائی کی غلطی سے برساتا کی 'س' موٹی ہو کر 'م' بن گئی تھی — ہی ہی ہی —"

ہم نے غُصّے سے کہا "امّی! اسے سمجھا لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میری تلوار تڑپ کر نیام سے باہر نِکل آئے اور میدانِ جنگ میں کُشتوں کے پُشتے لگ جائیں۔"

"اے بیٹے! خُدا کا نام لے۔" امّی بولیں "کیسی بُری

فالیں مُنہ سے نکالتا ہے۔ ویسے ہی سُنا ہے جنگ
چھڑنے والی ہے — چل، بتّی بُجھا دے اور پنکھا
تیز کر دے۔ نیند آ رہی ہے۔ مُوا حبس کِتنا ہے
اِ ای ناصرہ! تجھے ہوا آ رہی ہے؟"

ناصرہ باجی پرلے کونے میں سے بولیں" ہاں، کبھی
کبھی کوئی بچا کھچا جھونکا آ ہی جاتا ہے۔ ارے سعید!
یہ پرویز کی سیٹی اپنے پاس رکھ لے ورنہ صبح اُٹھتے
ہی بجا بجا کر سب کو جگا دے گا۔"

ہم نے سیٹی لے کر تکیے کے نیچے رکھ لی اور بتّی
بُجھا کر لیٹ گئے مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ اِتنا بڑا
برآمدہ اور ایک پنکھا۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد سب سو گئے اور برآمدہ ہلکے، بھاری
سُریلے اور بے سُرے خرّاٹوں سے گُونجنے لگا۔ اِن
میں نانی ٹخّو کے خرّاٹے سب سے بلند تھے۔ وہ
ایسی ڈراؤنی آوازیں نکال رہی تھیں جیسے بلّیاں لڑ
رہی ہوں۔

ہم نے بے چینی سے کروٹ بدلی تو سیما بولی:

"بھائی جان! جاگ رہے ہو؟"

"تمھیں بھی نیند نہیں آتی —؟" ہم نے پُوچھا۔

"نیند کیا خاک آئے" وہ بولی "ایک تو گرمی اور
اُوپر سے نانی کے خرّاٹے — کوئی کہانی سُنایئے!"

"کہانی سُناؤں کہ تماشا دِکھاؤں؟"

یہ کہہ کر ہم نے نانی ٹخّو کی طرف دیکھا وہ چت
لیٹی بالکل بے خبر سو رہی تھیں اور سانس کے ساتھ
ان کے ہونٹ ایسے پھڑپھڑا رہے تھے جیسے لوہار
کی دھونکنی سے بھٹّی میں شُعلے پھڑپھڑاتے ہیں۔

"تماشا —؟" وہ کُہنی کے بَل اُٹھ کر بولی "تماشا
کیسا —؟"

"ایسا دِل چسپ اور مزے دار کہ تم نے کبھی نہ
دیکھا ہو۔" ہم نے کہا اور تکیے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"دِکھایئے —" وہ آہستہ سے بولی۔ اندھیرے
میں اُس کی آنکھیں حیرت اور دِل چسپی سے چمک
رہی تھیں۔

"پہلے وعدہ کرو کہ بھانڈا نہیں پھوڑو گی کیوں کہ

جُوتے کھانے کا خطرہ ہے۔"

"جُوتے پڑے تو دونوں آدھوں آدھ کر لیں گے۔"

وہ بولی "شرُوع کے تم کھا لینا اور آخر کے ہیں۔"

"آخِر کے کیوں ۔۔۔؟" ہم نے پُوچھا۔

بولی "آخر میں مارنے والے کے ہاتھ جو تھک جاتے ہیں۔"

"بڑی ہوشیار ہو۔ پھر بھی امتحان میں تھرڈ آتی ہو۔"

"تمھاری طرح رٹّا جو نہیں لگاتی جناب! ۔۔۔ دماغ سے کام لیتی ہُوں ۔۔۔ اچھّا، چھوڑو، ان باتوں کو۔ تماشا دِکھاؤ۔"

ہم نے تکیے کے نیچے سے سیٹی نکالی اور چُپکے سے سیما کے پلنگ پر چلے گئے۔ نانی تُخّو کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ایسی سو رہی تھیں جیسے اب کبھی نہیں اُٹھیں گی۔ ہم نے سیٹی اُن کے مُنھ میں ٹھونسی اور دونوں ہونٹ بند کر دیے۔ بے چاری کا پوپلا مُنھ تھا۔ سیٹی ہونٹوں سے ایسے چپک گئی جیسے لیئی لگا دی گئی ہو۔ اب جو نانی تُخّو سانس لیتی ہیں تو آواز نِکلتی ہے ۔۔۔ "پھُرررہیں۔ پھُرررہیں" سیما کا یہ حال کہ ہنسی روکے نہ رُکے۔

ہم جلدی سے اپنے پلنگ پر آ گئے اور ایسے بن گئے جیسے پتا ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اُدھر نانی تُخّو برابر پھُرررہیں ۔۔۔ پھُرررہیں کیے جا رہی تھیں۔

یکایک نانی تُخّو نے ایک لمبی سی گہری سانس لی،

اور سیٹی میں سے ایسی زور کی آواز نکلی کہ امّی گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں — اُنھوں نے حیرت سے نانی تخّو کو دیکھا اور بولیں "اے نانی! — او نانی! یہ کیا کر رہی ہو؟"

نانی تخّو بولیں "پھُررررر ہیں —"

اِس پر امّی کا پارہ چڑھ گیا۔ چلّا کر بولیں "اے بی! — ذرا اِس بُڑھیا کو تو دیکھو۔ وُہی مثل ہے کہ بُوڑھے مُنہ مہاسے، لوگ کریں تماشے — یہ عُمر اور یہ چوچلے۔ اے نانی! — سیٹی بجانے کے لیے رات ہی رہ گئی تھی۔ سارے گھر کی نیند حرام کر دی لے کے۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے نانی تخّو کو زور سے جھنجوڑا۔ وہ سمجھیں کوئی آفت آ گئی ہے — جلدی سے جُوتیاں ہاتھ میں لیں اور ہو ہو کرتی صحن میں دوڑنے لگیں۔ شور سُن کر تمام عورتیں جاگ گئیں اُنھوں نے سمجھا کوئی چور گھس آیا ہے۔ سب بے تحاشا چیخنے لگیں۔ اِس چیخم دھاڑ میں بچّوں

کی بھی آنکھ کھُل گئی اور اُنھوں نے ایسی دُہائی دی کہ سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔

غُل غپاڑے کی آواز بیٹھک میں گئی تو ابّا جان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ اُن دِنوں ڈاکے بہت پڑ رہے تھے۔ وہ سمجھے ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ جھٹ بندوق لے کر اندر گھُس آئے۔ کچھ دیر ہکّا بکّا کھڑے نانی اور امّی کو گھُورتے رہے۔ پھر بولے "لاحول ولاقوۃ — ! یعنی، یہ کیا ہو رہا ہے —؟ حد ہو گئی — میں کہتا ہُوں یہ پاگلوں کی طرح شور کیوں مچا رہی ہو؟"

امّی ہانپتی ہُوئی بولیں "اِس بُڑھیا نے تو قیامت برپا کر دی — غضب خدا کا! ایک تو سیٹی بجا رہی تھی اور میں نے روکا تو بھاگنا شرُوع کر دیا۔"

"سیٹی بجا رہی تھی —؟" ابّا جان تعجُّب سے بولے "لاحول ولا قوۃ! دماغ چل گیا ہے اِس کا؟"

سِیما مُنھ میں دوپٹّا ٹھُونسے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اُس سے ضبط نہ ہو سکا تو

کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

ابا جان نے مُڑ کر حیرت سے اُسے دیکھا اور بولے "اِس کا کیا مطلب ـــ؟ یہ لڑکی کیوں ہنس رہی ہے؟ اے لڑکی! ـــ سچ سچ بتا کیا معاملہ ہے، ورنہ یاد رکھ، میری بندُوق بھری ہُوئی ہے!"

بندُوق کا نام سُنا تو سیما کی رُوح فنا ہو گئی۔ جلدی سے تھُوک نِگل کر بولی "ب ب ب بات یہ ہے ـــ خ خ خالو جان ـــ! کہ نانی ٹھّو کے مُنھ میں بھائی جان نے ـــ سیٹی ٹھُونسی تھی اور"

"اے ہے ـــ!" امّی نے سر پر ہاتھ مار کر کہا "تو یہ سعید صاحب کی کارستانی تھی؟"

"کہاں ہے یہ سعید کا بچّہ ـــ؟" ابا جان نے ہماری طرف بڑھتے ہُوئے کہا اور پاس آ کر کان پکڑ کے جو کھینچا تو ہم ایک دم اِسٹینڈ اپ ہو گئے۔

"چل، میرے پاس بیٹھک میں سونا ـ شیطان کہیں کا!"

اُس دِن سے نانی ٹھّو ہمارے گھر کبھی نہیں آئیں۔

خُدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے!

ہائے اللہ سانپ

نِکلتی گرمیوں کی ایک سُہانی شام تھی۔ آنگن میں پلنگ پڑے تھے۔ امّی جان اور خالہ جان پڑوسنوں کے جھُرمٹ میں بیٹھی حسبِ دستُور تیری میری بُرائیاں کر رہی تھیں۔ سب کے مُنھ میں پان ٹھُنسے تھے۔ ساتھ ہی سروتا بھی مُدھر تانیں اُڑا رہا تھا۔

نارنگی کے پیڑ کے پاس ہم محلّے کے بچّوں کو "عامِل معمُول" کا تماشا دِکھا رہے تھے۔ ہم "عامل" تھے اور ہماری خالہ زاد بہن سیما "معمُول" ـــ ہم ابّا جان کی کالی اچکن پہنے ہُوئے تھے اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ ہم نے ڈنڈا سیما کے مُنھ

کے سامنے لہرایا اور بولے "کالی مائی کلکتے والی
تیرا وار نہ جائے خالی - چھو - چھو - چھو — "
اور سیما جھوٹ موٹ بے ہوش ہو کر پلنگ
پر گر پڑی - ہم نے اس کے اوپر چادر ڈال دی۔
اور بچوں سے بولے "دیکھیے صاحبان!"
کیا ہی کنڈل مار کے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا۔
اب ہم آپ کو جادو کا کھیل دکھائیں گا - مگر
پہلے آپ سڑک چھوڑ کر چار قدم آگے آ جائیں؛
ایسا نہ ہو کہ پولیس والا چالان کر دے .. ٹھیک

ہے - اب بچہ لوگ زور سے تالی بجائے -
اور بچہ لوگ نے اتنی زور سے تالیاں بجائیں
کہ امی جان چیخ کر بولیں "لے بیٹے! کبھی تو چین
سے بیٹھا کر - توبہ ہے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا
ہے - موئی چھٹیاں کیا آتی ہیں ، میری جان
کو مصیبت آتی ہے -" یہ کہہ کر آپ ایک پڑوسن
کی طرف مڑیں اور بولیں " ہاں تو سروری! میں
کیا کہہ رہی تھی - ارے ہاں! یاد آیا - اس موئے
ماسٹر رحمت علی کا ذکر تھا - بہن اس کی مثل تو
وہ ہے کہ ایتر کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ
بھیتر! اوچھے آدمی کو خدا پیسا دیتا ہے تو وہ
اتراتا پھرتا ہے ... ..."

امی جان کی گاڑی نے پٹڑی بدلی تو ہم نے
پھر کھیل شروع کر دیا - "ہاں تو مہربان! دیکھیے!
ہم نے اس لڑکی پر جادو کیا ہے - اب اس
کا دماغ آئینے کے مانند ہو گیا ہے - ہم اس
سے جو پوچھیں گا - وہ یہ بالکل سچ سچ بتائیں گا -"

یہ کہہ کر ہم سیما سے بولے "اے لکڑی! — آئی
ایم سوری۔ اے لڑکی! بتا تو کون ؟
سیما بولی ۔"معمول"
ہم بولے " اور ہم کون ؟"
بولی:" نامعقول۔"
ہم نے اِس کے پیر میں چٹکی لی تو چیخ کر
بولی ۔ "عامل عامل ۔"
ہم نے کہا" شاباش! اب بتا! جو پوچھیں گا۔
بتائیں گا ؟"
وہ ناک میں بولی:" بتائیں گا۔"
ہم بولے:" جو کھلائیں گا وہ کھائیں گا۔"
بولی:" جوتے نہیں کھائیں گا، باقی سب کچھ
کھائیں گا۔"
ہم بولے:" کھانے سے پہلے یہ بتا کر یہ لڑکا
کون ہے ؟"
بولی:" آئی۔ ایم سوری۔ آپ نے اِتنی موٹی
چادر اوڑھا دی ہے کہ ہم کو دِکھائی نہیں دیتا۔

باریک چادر اوڑھایئے۔ پھر بتائیں گا۔"
سب بچے کِھلکھِلا کر ہنس پڑے۔ ہم نے کھڑے
ہو کر سر کھجایا اور سوچنے لگے بات کِس طرح بنائیں
کہ ایک دم گڑبڑ مچ گئی۔
ہمارا چھوٹا بھائی مسعود کمرے میں سے بھاگتا
ہوا آیا۔ خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ آنکھیں
پھٹی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ نِکل رہا تھا۔
آتے ہی چیخ مار کر پلنگ پر چڑھ گیا اور بولا:
گھک گھک گھک" تمام عورتیں گھبرا گئیں۔
امّی دوڑی آئیں اور بولیں" میرے لال!
میری جان! ماں صدقے، ماں قربان بتا تو سہی
کیا ہوا ؟"
مسعود میاں آنکھیں اور منہ دونوں پھاڑ کر
بولے" گھک گھک گھک گھک۔"
امّی سر پیٹ کر بولیں:" ہے ہے! کسی آفت
بلا سے ڈر گیا ہے۔ اللہ کی امان، پیروں کا
مایہ، دوست شاد، دشمن ناشاد۔ نیکی کا بول بالا۔

بدی کا منھ کالا - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ___ یٰسین
والقرآن الحکیم ... ..."
خالہ جان بولیں "اے آپا - ہوش کے ناخن ل
یاسین تو مرتے وقت پڑھتے ہیں -"
مسعود کی گھگھی بندھی ہوئی تھی - جب لاکھ پوچھ
پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا تو ہم نے لپک کر د
چپت رسید کیے - آپ منھ بسور کر بولے "مار
کاہے کو ہو؟ کہہ تو رہے ہیں کہ اندر کمرے
میں سانپ ہے، کرسی کے نیچے -"
سانپ کا نام سن کر تمام عورتوں کو سانپ
سونگھ گیا اور ہم بھی بغلیں جھانکنے لگے - گ
پھر ذرا ہمت کی اور گلا صاف کر کے بولے "گ
آپ کمرے میں کیوں گئے تھے؟"
مسعود صاحب بولے "ہم الماری میں سے
بسکٹ نکال رہے تھے" یہ کہہ کر آپ نے س
کھجایا اور جلدی سے بولے "بسکٹ تھوڑی نکا
رہے تھے - ہم تو ___ ہم تو ___ کیا نام اس کا

بسکٹوں کا نام سنا تو امی سانپ کو تو گئیں بھول
اور چیخ کر بولیں "گھر میں کوئی چیز آ جائے تو
جب تک اسے کھا پی کر ختم نہ کر دیں یہ بچے
تب تک مانتے تھوڑی ہیں - بیٹا! آج ہی تو نے
آٹھ بسکٹ کھائے تھے اور اب پھر آنکھ بچا
کر الماری میں گھس گیا - توبہ ہے ایسے بچے بھی
میں نے ... ..."
خالہ جان بات کاٹ کر بولیں "اے آپا!
بسکٹوں کو چھوڑو - سانپ کی فکر کرو -"
امی گھبرا کے بولیں "ارے ہاں! جا تو سعید!
بیٹھک میں سے اپنے ابا جان کو بلا لا - کہنا محلے
کے آٹھ دس آدمیوں کو بھی ساتھ لیتے آئیں -"
اور ہم جا ہی رہے تھے کہ ابا جان موٹا سا
ڈنڈا لے کر اندر آ گئے - کسی بچے نے انھیں پہلے
ہی سے خبر کر دی تھی - پیچھے چچا جان بھی تھے -
آگے آگے یہ دونوں، ان کے پیچھے امی اور
خالہ جان اور ان کے پیچھے ہم کمرے میں داخل

ہُوئے ۔ دائیں طرف کونے میں الماری تھی اور اس
کے پاس ہی ایک کُرسی ۔ برآمدے میں سے ہلکی
ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی اور اس دُھندلی روشنی
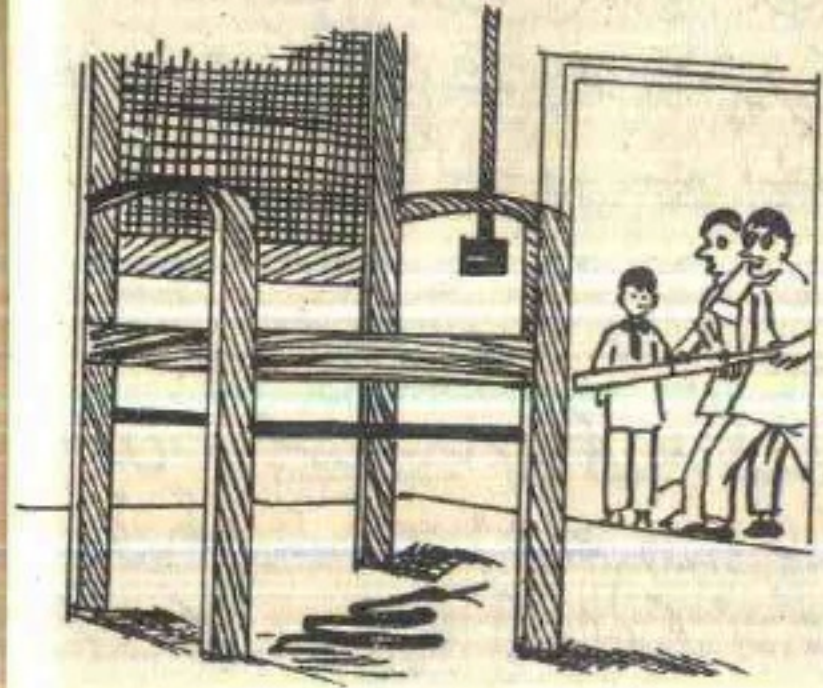
میں ہم نے دیکھا کہ کُرسی کے نیچے ایک پتلا سا کالا
سیاہ ناگ کُنڈلی مارے بیٹھا ہے ۔ ہمیں غش آنے
کو تھا کہ ابّا جان نے آگے بڑھ کر کمرے کی
بتّی جلا دی ۔ سارا کمرا روشنی سے جگمگا اُٹھا ۔
امّی جان نے اپنا وظیفہ شرُوع کر دیا ۔ "اللہ کی
مان ۔ پیروں کا سایہ " ابّا جان لاٹھی ہاتھ میں

پکڑے آہستہ آہستہ کُرسی کی طرف بڑھے اور سانپ
کو لاٹھی میں لپیٹ کر اُوپر اُٹھا لیا مگر یہ کیسا سانپ
تھا ۔ نہ تو وہ تڑپا اور نہ اُس نے بل کھایا ۔ لاٹھی
کے ساتھ اِس طرح چلا آیا جیسے رسّی ہو ۔ ابّا جان
نے اُسے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولے "لاحول ولاقوۃ ۔
یہ تو ازار بند ہے ——"

اب تو اِتنے قہقہے پڑے کہ کان پڑی آواز نہ
آئی ۔ مسعُود میاں جھینپ کر بولے "ہم نے دیکھا تھا
تو یہ سانپ تھا ۔ اب اِس نے بھیس بدل لیا ہے"
اِس ہڑبونگ میں رات کافی گزر گئی تھی ۔ محلّے
کی عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں اور ہم سب
اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے ۔ امّی نے زور
کی جمائی لی اور بولیں "سعید میاں ! تُمھارے سرہانے
تپائی پر میں نے پانی کا جگ اور گلاس رکھ دیا
ہے ۔ رات کو پیاس لگے تو مجھے مت اُٹھانا بیٹا !
ماشاءاللہ 12 سال کے ہو گئے ہو، ابھی تک
ڈرتے ہو ؟"

ریما کھوں کھوں کر کے ہنسی تو ہمیں بہت
غصّہ آیا۔ بولے "امّی! میں ڈرتا تھوڑی ہوں۔ میں
تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہو گی۔
جائیے۔ آج سے میں آپ کو نہیں اٹھاؤں گا۔"
ابّا جان بولے "میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔"
"اور کیا ——" ہم سینہ پھلا کر بولے۔ "بڑا ہو
کر میں تھانیدار بنوں گا اور سب سے پہلے ریما
کو حوالات میں بند کروں گا۔"

ریما نے چادر تان لی اور بولی "تھانیدار نہیں
تو جمعدار ضرور بنو گے۔" یہ کہہ کر ہنسی اور آہستہ
سے بولی "بھنگیوں کے۔"

ہم بھنّا کر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے اور تڑخ
کر بولے "دیکھیے امّی جان! اِسے سمجھا لیجیے ورنہ"
ابّا جان نے کہا "بس اب پانی پت کی چوتھی
لڑائی شروع ہو جائے گی۔ چلو ریما! تم شمال کی
طرف مُنھ کرو اور سعید میاں! تم جنوب کی طرف۔
اب کوئی بولا تو اس کی خیر نہیں۔ شب بخیر۔"

ہم نے جواب دیا "شب بخیر!" اور آہستہ آہستہ
نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اور —— آدھی رات کو ہم سوتے سوتے ایک
دم چونک اُٹھے۔ بالکل چت لیٹے ہوئے تھے۔
چندا ماموں کی صاف اور چمکیلی روشنی میں، نیند کی ماتی،
ادھ کھلی آنکھوں سے ہم نے دیکھا کہ ایک نہایت
ہی کالی سیاہ، موٹی سی، لمبی سی، چمکیلی سی چیز ہمارے
سینے پر رینگ رہی ہے۔ پہلے تو سوچا کہ یوں ہی
پڑے رہیں۔ لیکن وہ چیز وہ کالی سیاہ اور چمکیلی سی
چیز دھیرے دھیرے گردن کی طرف آ رہی تھی۔ ہم
نے زور سے نعرہ مارا مگر آواز حلق ہی میں اٹک
کر رہ گئی۔ آخر بڑی مشکل سے ہمّت کی اور ایک
دم اِس کالی سیاہ، چمکیلی اور موٹی سی چیز کو دونوں
ہاتھوں میں پکڑ لیا اور زور سے بولے "گھک گھک
گھک گھک۔"

ہمارے پاس ہی امّی جان اور خالہ جان کے پلنگ
تھے اور کچھ دُور ابّا جان سو رہے تھے۔ تینوں گھبرا

کر اُٹھ بیٹھے۔ امّی نے ہمیں سینے سے چمٹا لیا اور بولیں "کیا ہُوا میرے بیٹے! کیا ہُوا میرے لال!"

ہم بتاتے کیا خاک۔ ڈر کے مارے ہوش و حواس گُم تھے۔ بس گھک گھک کیے جا رہے تھے۔

امّی جان نے فوراً اپنا وظیفہ شروع کر دیا "اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دوست شاد، دُشمن ناشاد۔۔۔"

ابّا جان نے ڈانٹ کر پوچھا "بولتا کیوں نہیں؟ آخر ہُوا کیا؟ یہ سیما کی چُٹیا کیوں پکڑ رکھی ہے؟ اسے تو

چھوڑ۔" سب لوگ پریشان تھے مگر سیما مُنہ میں دوپٹا ٹھونسے ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آخر یہ معاملہ کیا ہے؟" ابّا جان جھلّا کر بولے۔ "اِس کے ہاتھ میں سیما کی چُٹیا کیسے آئی؟ اور آئی تو اس نے شور کیوں مچایا اور شور مچایا تو اب خاموش کیوں نہیں ہوتا؟"

سیما بولی "خالو جان! میں بتاؤں مگر پہلے بھائی جان کے ہاتھ سے میری چُٹیا چھڑوا دیجیے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔"

ابّا جان نے ہماری مُٹھیاں کھول کر اُس کی چُٹیا چھڑا دی۔ ہم ابھی تک آنکھیں پھاڑے، مُنہ کھولے، ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ اُٹھائے اُلّو کی طرح گھور رہے تھے۔

سیما بولی "بات یہ ہُوئی خالو جان کہ مجھے لگی پیاس۔ میں پانی پینے کے لیے بھائی جان کے سرہانے آئی۔ گلاس میں پانی بھرا اور ان کی چارپائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔ اِتّفاق سے میری چُٹیا اِن کے سینے پر پڑ گئی۔

یہ سمجھے کہ سانپ ہے اور خواہ مخواہ ڈر گئے۔

"لاحول ولا قوۃ ـــــ" ابّا جان ہنسنے لگے۔

خالہ جان بولیں "بیٹی! تیری چٹیا بھی تو دس گز لمبی ہے۔ توبہ ایسے بال بھی ہم نے کسی کے نہیں دیکھے ـــــ جا اب جا کے سو جا۔"

صبح ہوئی تو ہم نے سیما کی خوشامد کی کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مگر توبہ وہ سیما ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے سارے محلّے کو یہ بات بتا دی اور ہوتے ہوتے ہمارے سکول کے لڑکوں کو بھی ہماری بہادری کا یہ قصّہ معلوم ہو گیا اور کئی مہینوں تک ہم شرم سے سر جھکائے جھکائے پھرے۔

آئی ہے برات

اب یہ کوئی سچ مچ کا بیاہ تو تھا نہیں کہ اس میں سارے محلّے اور کنبے ٹبّر کی ٹھاٹ دار دعوت ہوتی، باجا گاجا بھی ہوتا اور مراثیوں کا ناچ بھی۔ ایک گڑیا کا بیاہ تھا اور گڑیا بھی کیسی کہ جس نگوڑی کے سر پر دوپٹا نہ تن پر چیتھڑا۔ لیکن بھیّا سعید سر تھے کہ بھئی بیاہ ہو تو ایسا ہو کہ سو دیکھیں تو نو سو تعریف کریں۔ اگر پورے کنبے ٹبّر کی دعوت نہ ہو تو کم سے کم محلّے والے تو ضرور ہی شریک ہوں۔ رہے ان کے دوست۔ سو اوّل تو وہ ہیں ہی کتنے پھر اتنے بندوں میں دو چار ایرے غیرے بھی کھپ ہی جاتے ہیں۔

امّی جان بولیں" بھئی دُولھا والیوں سے بھی پُوچھ
لو۔ دیکھو وہ کیا صلاح دیتی ہیں۔"
راتوں رات نائن کے ہاتھ تسنیم کو بُلایا اور اس
سے مشورہ کیا تو وہ بولی :" بہن ، مہنگائی کا زمانہ ہے۔
اگر آج کسی سے قرض اُدھار لے کر ذات برادری
میں واہ وا کروا بھی لی تو کل اس کا انجام بُرا
ہو گا۔ اِس لیے میری مانو دو چار لڑکیوں کو بُلا
لو۔ دو چار کو میں بُلا لوں گی۔"

امّی جان ہماری باتیں غور سے سُن رہی تھیں۔
ہمیں بڑی بُوڑھیوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ کر ہنس
پڑیں اور ہاتھ ہلا کر بولیں" لے لو تم خرچ کی پروا
مت کرو۔ محلّے کی لڑکیاں تو آئیں گی ہی۔ سکُول
کی لڑکیوں کو بھی بُلا لینا۔"
بھیّا سعید بھنّا کر بولے:
"جی ہاں۔ ان کی تو سب چڑیلیں آئیں گی اور ہمارا
ایک دوست بھی نہیں۔" تسنیم ہنس کر بولی" اچھا بھئی

تم بھی دو چار بھوت بلا لینا۔"

"ارے بھئی لڑو مت" امّی جان صلح کراتے ہوئے
بولیں "سعید کے دوست آئیں گے تو تمہارا ہی
فائدہ ہو گا۔"

تسنیم ہاتھ نچا کر بولی "کیا خاک فائدہ ہو گا۔
ہنڈیا تک چاٹ جائیں گے نگوڑ مارے۔"

سعید بھائی چڑ کر بولے "اور امّی جان ان کی
چڑیلیں منہ میں کپڑا ٹھونس کر آئیں گی (منہ بسور کر)
لو بھئی ہم نے سوچا تھا ہماری بہن سیما کی گڑیا
کا بیاہ ہے۔ اپنے سکول کا بینڈ لائیں گے مگر..."

بینڈ کا نام سنتے ہی میں پھڑک اٹھی۔ تسنیم جل
گئی اور امّی جان جھوم کر بولیں "بس بھئی ٹھیک ہے
اب کوئی اچھا سا دن مقرر کر لو۔"

میں بولی "اتوار کا دن ٹھیک ہے۔ چھٹی بھی ہو
گی۔"

تسنیم اٹھلا کر بولی "اچھی بات ہے بہن۔ اب
میں جاتی ہوں۔ کچھ بندوبست بھی تو کرنا ہے آخر۔"

اتوار کے دن صبح ہی سے ہم تیاریوں میں مصروف
ہو گئے۔ تمام گھر کو جھاڑ پونچھ کر چندن بنا دیا۔
دالان میں چٹی چٹی چادروں کا فرش کر کے نہایت
قرینے سے گل دان، اگال دان اور خاصدان سجا
دیے۔ امّی جان کا تو عجیب حال تھا۔ ایک قدم
باورچی خانے میں تو دوسرا دالان میں۔ کبھی ماما کو
ہدایت کرتیں "اے نگوڑی، زردے میں الائچیاں
اور زعفران ڈالنا مت بھول جانا۔" کبھی مجھ سے
اور نکہت سے کہتیں "یہ گاؤ تکیہ ادھر رکھو۔ ایک
خاصدان یہاں بھی ہونا چاہیے۔" غرض عجب ہماہمی
اور گہما گہمی کا عالم تھا کہ تھوڑی دیر میں مہمان آنے
شروع ہوئے۔ جسے دیکھو ہنستا اور کھل کھلاتا چلا
آ رہا ہے۔ جب سارا گھر بھر گیا تو امّی جان بولیں
"اے، یہ منہ بند کر کے کیوں بیٹھی ہو؟ کچھ ہنسو
بولو۔ گاؤ بجاؤ۔"

امّی جان کا یہ کہنا تھا کہ وہ اودھم مچا کہ خدا کی
پناہ۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی اور سب نے مل کر

آواز نکالی:

"گوندھ کر لائیو پھولوں کا تو مالن سہرا"

ابھی یہ غل غپاڑا مچ ہی رہا تھا کہ ماما دوڑی ہوئی آئی اور بولی "بی بی جی، برات آ رہی ہے۔" سب خاموش ہو گئے اور ٹھیک ٹھاک کرنے لگے کہ اتنے میں برات داخل ہوئی۔ آگے آگے سعید بھائی کا بینڈ تھا۔ اس کے پیچھے دولھا میاں اور ان کے پیچھے بچّے اور بچّیوں کی ایک فوج ایک سمندر تھا، خوشی اور مسرّت کا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

سب قرینے سے بیٹھ گئے تو سعید بھائی نے جاوید کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ اور سعید بھائی بولے "بھئی، دولھا میاں رات روٹی ذرا زیادہ کھا گئے تھے۔ بے چاروں کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اِس لیے نِکاح ابھی پڑھا دینا چاہیے۔" یہ کہہ کر زور سے پکارا:

"اجی قاضی صاحب، اجی قبلہ قاضی صاحب!"

کیا دیکھتے ہیں کہ قاضی صاحب چلے آ رہے ہیں:

پیروں تک اچکن، سر پر بڑی سی پگڑی، لمبی سی ڈاڑھی، اور ناک پر ٹوٹی ہوئی عینک۔ یہ جاوید تھا۔ جس نے دیکھا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ قاضی صاحب آ کر سب کے بیچ براجمان ہو گئے اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے "اچھّا بھئی سب سے پہلے دُلھن کا نام بتاؤ۔"

میں نے کہا "دُلھن کا نام پھلجڑی بیگم۔"

بھیّا سعید بولے "دُولھا کا نام شیخ لٹو بخش۔"

قاضی صاحب بولے "سُبحان اللہ کیا جِناتی نام ہے۔ خیر اب نکاح شروع ہوتا ہے۔" یہ کہہ آپ دُولھا سے بولے —

اِملی کے پتّے ببُول کے پھُول
کہو میاں گڈّے گُڑیا قبُول

اب کوئی سچ مچ کا دُولھا ہوتا تو "ہاں" کہتا بھی - میاں گڈّے کیا کہتے خاک ؟ اِس لیے سعید بھائی بولے "قبُول"۔

قاضی صاحب بولے "استغفرُاللہ ! اماں نِکاح آپ کا ہو رہا ہے یا شیخ لٹّو بخش کا ؟ جب تک دُولھا ہاں نہ کہے گا نکاح ہرگز نہ ہو گا - یہ شریعت کا مُعاملہ ہے بچّوں کا کھیل نہیں ۔"

اب تو ہم لوگ بڑے پریشان ہوئے - آخر بڑی دِقّت سے قبلہ قاضی صاحب کو ایک چونّی دے کر راضی کیا اور نِکاح بخیر و خُوبی ختم ہُوا -

شام کو سب مہمانوں نے مِل جُل کر کھانا کھایا اور اب برات رُخصت ہونا شرُوع ہُوئی "ہائے میری پیاری گُڑیا - ہمیشہ کے لیے مجُھ سے جُدا ہو رہی ہے. کتنے چاؤ سے بنوائی تھی میں نے -" میری آنکھوں میں آنسُو آ گئے - پلٹ کر امّی جان کو دیکھا تو وُہ

بھی دوپٹّے سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں - میں حیرت سے بولی "ارے امّی جان ! آپ بھی — آپ بھی رو رہی ہیں ؟"

میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں "نہیں بیٹی - یُوں ہی - آنکھ میں کچُھ پڑ گیا تھا - تم برات کے ساتھ نہیں گئیں ؟"

میں ٹھنک کر بولی "تسنیم کہتی تھی دُلھن کے ساتھ دُلھن والے نہیں جایا کرتے" ہنس کر بولیں "چل چُڑیل - ارے سعید بیٹا ، رسما کو تسنیم کے گھر پہنچا آؤ ———"

اے حضرتِ مچھرّ ررر

کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں نمرُود نامی ایک
بادشاہ تھا ۔ بڑا مغرُور اور شیخی خورا ۔ ایک دن بیٹھے
بٹھائے اس کا سر جو کھجایا تو تمام مُلک میں ڈُگی
پٹوا دی کہ میں خُدا ہُوں ۔ مجھے پُوجو ۔ میری عبادت
کرو ۔ مجھ سے بڑا کوئی نہیں

اللہ میاں نے ایک حقیر اِنسان کو اِتنی بڑی ڈینگ
مارتے دیکھا تو اس کی شیخی کرکری کرنے کے لیے
مچھروں کی ایک فوج بھیج دی ، جس نے آتے ہی
وہ تباہی مچائی کہ خُدا کی پناہ ! جس کے کاٹا ، وہ
کھجاتے کھجاتے ہی مر گیا اور اس طرح میاں نمرُود

اور ان کی ساری فوج خُدا گنج سدھار گئی ۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ نہ تو وہ نمرُود
ہی باقی ہے اور نہ اُس کی خُدائی ۔ مگر حضرت مچھرّ
بدستُور موجُود ہیں اور رات کو ایسی شان و شوکت کے

ساتھ تشریف لاتے ہیں کہ بے چارے سونے والوں
کی نیند حرام ہو جاتی ہے ۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ تمام کاٹنے والے کیڑوں
میں صرف مچھر ہی ایک ایسا بہادر کیڑا ہے جو ڈنکے
کی چوٹ کاٹتا ہے ۔ للکار پکار کر کہتا ہے کہ اے
بد نصیب انسان! ہوشیار ہو جا ۔ میں تجھے کاٹنے
والا ہوں ۔ تجھ سے کچھ کیا جائے تو کر لے ۔ مگر
بھئی خاک پڑے ایسی بہادری پر اور بھاڑ میں
جائے ایسی دلیری ۔ ارے بھئی کاٹنے سے کون
بے وقوف منع کرتا ہے ۔ کاٹو اور خوب کاٹو ۔
ٹانگ میں کاٹو ۔ ہاتھ میں کاٹو ۔ منھ پر کاٹو ۔ بالوں
میں گھس کر بیچ کھوپری میں کاٹو ۔ ناک میں گھس
کر بھیجا چاٹ لو ۔ مگر خدا کے واسطے کان پر آکر
بینڈ تو نہ بجاؤ ۔ اس سے ہماری نیند اچاٹ ہوتی
ہے اور صبح کو سکول میں بیٹھ کر اونگھو تو
ماسٹر صاحب کے جوتے کھانے پڑتے ہیں ۔ مگر
کسے سمجھائیں اور کون سمجھے ؟ حضرتِ مچھر اپنی
عادت سے باز آنے والے تھوڑی ہیں ۔ کان پر
ہی آ کر شور مچائیں گے ۔ اب کسی سے کچھ کیا

جائے تو کر لے ان کا ۔

آخر بے چارے کھٹمل بھی تو ہیں ۔ کتنے شریف،
کتنے نیک اور کتنے خدا ترس ۔ کاٹتے ہیں، یہ مانا ۔
مگر نہایت سلیقے اور تمیز کے ساتھ کہ کاٹنے والا
بھی خوش اور کٹوانے والا بھی ۔ اگر ایک پہلو میں
کاٹ لیں تو دوسرا بدل لو ۔ اس میں کاٹ لیں
تو پیٹھ کے بل لیٹ جاؤ ۔ پیٹھ میں بھی کاٹ لیں
تو اوندھے پڑ جاؤ ۔ پھر بھی کاٹ لیں تو اٹھ کر
بیٹھ جاؤ ۔ اب بھی نہ مانیں تو کھڑے ہو جاؤ ۔
بھئی خدا نخواستہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو اس
چارپائی پر تو بھیجو دو حرف اور کسی دوسری چارپائی
پر لیٹ کر آرام سے سو جاؤ ۔ چلو جھگڑا ختم ہوا ۔

لیکن یہ حضرتِ مچھر اتنے موذی واقع ہوئے ہیں
کہ کسی کروٹ لیٹو، چت لیٹو، پٹ لیٹو، دوسری
چارپائی پر چلے جاؤ ۔ غرض کہ کوئی جتن کرو مگر
پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ اور پھر کاٹتے بھی ہیں اور ملہار
بھی گاتے ہیں ۔ گویا ایک ٹکٹ میں دو دو مزے ۔

خُدا معلوم ان کم بختوں کو مجھ ہی سے خُدا واسطے
کا بیر ہے یا یہ دُنیا کے ہر اِنسان کو اِسی طرح
پریشان کرتے ہیں۔ دِن بھر کے تھکے ہارے سونے
لیٹو تو بن بُلائے مہمان کی طرح جھٹ آ موجود ہوتے
ہیں اور کان کے سُوراخ کے بیچوں بیچ لہرا کر، بل کھا
کر، مٹک مٹک کر ایسی بے سُری اور بے تالی
قوّالیاں گاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ یا تو دونوں
ہاتھوں سے مُنھ نوچ لوُں اور یا کپڑے پھاڑ کر
جنگل کو نِکل جاؤں۔

امّی جان کہتی ہیں "بیٹا! رات بھر پھٹ پھٹ کرتا
رہتا ہے۔ مچھّر دانی لگا کر کیوں نہیں سوتا؟"

اب اِنھیں کون سمجھائے کہ بھئی! مچھّر دانی میں دم
جو گھُٹتا ہے ہمارا۔ ایک تو ویسے ہی سڑی گرمی،
اور اُوپر سے مچھّر دانی تان لی جائے۔ ہمیں تو ایسی
گھُٹن میں نیند نہیں آتی۔

روز روز کے رونے سے تنگ آ کر ایک دِن ہم
سر پکڑ کر سوچنے بیٹھے کہ اِن کم بخت مچھّروں سے

کِس طرح چھُٹکارا حاصِل کیا جائے۔ آخر سوچتے سوچتے
ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ خوشی کے مارے ہم اُچھل
پڑے اور تالیاں بجا کر بولے "اچھّا میاں مچھّرو!
تُم بھی کیا یاد کرو گے کہ کِسی عقل مند سے پالا
پڑا تھا۔ دیکھوں گا آج کِس طرح تُم میرے کان
پر ریڈیو بجاتے ہو۔"

رات ہُوئی اور سونے کا وقت آیا تو ہم نے
صحن میں اُسی طرح چارپائی بچھائی جِس طرح روز بچھاتے
تھے مگر بجائے سرہانے کی طرف سر کرنے کے

پائنتی کی طرف سر کیا اور چادر تان کر لیٹ گئے۔

ہت تیری کی! یہ ترکیب پہلے کیوں نہ سُوجھی؟
اب مچھّر خاں اپنے کُنبے سمیت آئیں گے تو یہی سمجھیں
گے کہ ہمارا مُنھ حسبِ دستوُر سرہانے کی طرف ہے۔
لہٰذا وہ اُدھر ہی شور مچانا شروع کر دیں گے اور ہم
اطمینان سے سوتے رہیں گے۔ واہ! سُبحان اللہ! کیا
مزے کی ترکیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب
اللہ میاں اپنے بندوں کو عقل بانٹ رہے تھے تو
ہم سب سے آگے تھے۔

خیر صاحب! دل ہی دل میں خوش ہو کر ہم سونے
کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ابھی آنکھیں پوُری طرح بند
بھی ہونے نہ پائی تھیں کہ ایک نہایت ہی سُریلی
آواز آئی:

آئے موسم رنگیلے سُہانے ایں ایں ایں

دُوسری آواز آئی۔ ع

سو جا راج کماری ری ری سو جا،

اور تھوڑی دیر بعد ایسا معلوم ہُوا جیسے نزاکت علی
سلامت علی اینڈ کمپنی نے قوّالی شرُوع کر دی ہے۔

جھُنجلا کر اُٹھ بیٹھا اور دیوانوں کی طرح ناک، کان اور مُنھ
کھسوٹنے لگا۔ ہائے اللہ! کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟
خُدا معلوم اِن کم بختوں کو کس طرح پتا چل گیا کہ میرا
مُنھ سرہانے کی طرف نہیں پائنتی کی طرف ہے۔ ذرا
سا کیڑا اور اِتنی سمجھ! کمال ہے صاحب!

خیر! میں نے بھی تہیّہ کر لیا کہ آج چاہے کچھ
ہو جائے، اِن مچھّروں کو جُل دیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔
پھر سر پکڑ کر سوچنے بیٹھا۔ یکایک ایک بڑی ہی انوکھی
اور اچھوتی ترکیب سمجھ میں آئی جسے سوچ کر پہلے
تو خوُب ہنسا اور پھر دہاڑیں مار مار کر رونے
لگا۔ ہنسا اِس لیے کہ ترکیب نہایت شان دار تھی۔
اور رویا اِس لیے کہ اِس میں ذرا تکلیف بھی تھی۔

سب سے پہلے میں نے ایک بڑا سا ڈنڈا لے کر
سارے مچھّروں کو بھگا دیا کہ یہ میری کارستانی
دیکھ نہ لیں۔ پھر بڑی پھُرتی سے دو تین تکیوں
کو چادر اوڑھا کر چارپائی پر لِٹا دیا اور خود
چارپائی کے نیچے زمین پر لیٹ گیا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مچھّر کیا مچھّروں کا باپ بھی مجھے چارپائی کے نیچے نہ دیکھ سکے گا۔

لیکن ابھی لیٹے ہُوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ حضرتِ مچھّر نے اپنی پارٹی سمیت دھاوا بول دیا اور حسبِ دستور قوّالی شرُوع کر دی۔

اب بھئی! میں تنگ آ چکا تھا۔ روہانسا ہو کر چارپائی کے نیچے سے نکلا اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "اے حضرتِ مچھّر! جب تُم نے نمرود جیسے

طاقت ور اور زبردست بادشاہ کو ناک چنے چبوا دیے تو میں ناچیز فقیر حقیر کس گنتی شمار میں ہُوں۔ لو میاں! کاٹو اور خوب کاٹو مگر ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں کمرے میں گیا۔ تھوڑی سی رُوئی لے کر کانوں میں ٹھونسی اور پھر چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں کہ مچھّروں نے مجھے کاٹا یا میں نے مچھّروں کو ۔۔۔ رات بھر بڑی مزے کی نیند آئی اور صبح کو اُٹھا تو چودہ طبق رُوشن تھے۔ سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور جسم بخار سے پھُنک رہا تھا۔ ہاتھ پیر اور چہرہ دیکھا تو ایسا معلوم ہُوا جیسے کسی نے نشانہ بازی کی مشق کی ہے۔ اُٹھ کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو وہ بولے "میاں! مچھّروں کے کاٹنے سے ملیریا ہو گیا ہے۔ جاؤ کونین کھاؤ اور مچھّر دانی لگا کر سویا کرو۔ ورنہ مر جاؤ گے۔

ڈاکٹر صاحب نے جو اُلٹی سیدھی باتیں سُنائیں

تو ڈر لگا۔ وہ دن اور آج کا دن، مچھردانی لگا کر سوتا ہوں۔ بلا سے دم گھٹتا ہے تو گھٹا کرے مچھر تو نہیں کاٹتے۔

ہائے اللہ بھوت

امتحان قریب تھے۔ رات بھر پڑھ پڑھ کر پچھلے پہر آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں سمجھا کوئی بھوت ہے۔ ایک دم اُٹھ کر بھاگا۔ مگر چور نے راستے ہی میں پکڑ لیا اور آہستہ سے بولا "ارے منّی میں ہوں میں۔ آنکھیں تو کھول" اب جو آنکھیں کھولیں تو "ارے آپا جان آ آپ؟" بولیں ــــ "اور نہیں تو کیا چور۔ سُن تو سہی یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔"

میں نے کان کھڑے کیے تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی درد کے مارے کراہ رہا ہے۔ اُوںھ۔ اُونہہ۔

ہُوں ۔ ہُوں ۔" خوف کے مارے میری تو جان ہی
نِکل گئی ۔ ایک دم کُود کر چارپائی سے اُٹھا اور
ایک ہی جست میں آبّا جان کی چارپائی پر دھم
سے جا گِرا ۔ وہ بے چارے میٹھی نیند سو رہے
تھے ۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور گھبرا کر بولے ۔ "کیا
بات ہے مُنّی بیٹے ؟"

"بھ بھ بھ بھُوت ۔" میں نے کانپتے ہُوئے کہا ۔
"اُوپر چھت پر بھُوت ہے ۔" اِس ہڑبونگ میں
امّی جان کی بھی آنکھ کھُل گئی تھی اور وہ سوالیہ نشان

بنی ہماری صُورت تک رہی تھیں ۔ "مُنّی کہتا ہے اُوپر
چھت پر کوئی بھُوت ہے ۔ سوتے میں ڈر گیا ہے
شاید ۔" آبّا جان نے امّی کو سمجھایا ۔ وہ بولیں : "ہے ہے
میں نہ کہتی تھی اِس گھر میں ضرُور کوئی نہ کوئی آسیب
ہے ۔ کل دوپہر میں بھی اُوپر گئی تھی کہ اِس کوٹھڑی
کو کھول کر دیکھوں ۔ مگر یہ دہشت ناک آوازیں سُن
کر اُلٹے پاؤں لوٹ آئی تھی ۔" آبّا جان بولے :
"کیسی باتیں کرتی ہو ۔ بچّے تو خیر بچّے ہیں تُم بڑھاپے
میں جن بھُوتوں سے ڈرتی ہو ۔ چلو بیٹا مجھے دِکھاؤ
کہاں ہے وہ بھُوت ؟"

اُوپر پہنچے تو آپا جان نے کہا : "میں سو رہی تھی
کہ مجھے کِسی کے رونے کی آواز آئی ۔ ایسا لگتا تھا
جیسے کوئی کِسی کا گلا گھونٹ رہا ہے ۔" آبّا جان
بولے ۔ "بیٹی شاید پڑوس میں کِسی کو کوئی تکلیف ہو ۔"

"نہیں آبّا جان یہ آواز تو یہیں کہیں سے آ
رہی ہے ۔" آپا جان نے کہا ۔ آبّا جان نے پُوچھا
"یہیں کہیں ؟ یعنی — ؟" آبّا جان نے کہا : "اس

کوٹھڑی میں سے ۔۔۔" اور ہم سب کی نگاہیں کوٹھڑی کے پرانے کرم خوردہ دروازے پر لگ گئیں جس پر ایک زنگ لگا تالا پڑا جھول رہا تھا۔

چھت پر صرف وہی ایک کوٹھڑی تھی۔ ابا جان آہستہ آہستہ کوٹھڑی کی طرف بڑھے اور قریب پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا:

"ہوں ہوں غرررر۔" امی جان لرز کر بولیں "ہے خدا کو مانو۔ ضرور کوئی نہ کوئی بھوت ہے۔"

"ابا جان صبح کو کیوں نہ دیکھیں۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ امی جان شہ پا کر بولیں:

"ہاں ہاں صبح کوئی دور تھوڑی ہے اور پھر اس وقت تالا کھولنا بھی تو مشکل ہو گا۔" آپا جان نے بھی امی جان کی ہاں میں ہاں ملائی اور معاملہ صبح پر چھوڑ دیا گیا۔

ہمیں پاکستان آئے کافی عرصہ ہو گیا تھا مگر ابھی تک ٹھور ٹھکانا نصیب نہ ہوا تھا۔ ویسے ابا جان کو لاہور میں ایک دکان مل گئی تھی اور ہم لوگ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں رہ رہے تھے۔ آخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد یہ مکان ملا تھا۔ اس میں دو کمرے تھے۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا باورچی خانہ تھا اور اوپر چھت پر ایک کوٹھڑی تھی جس میں وہ کم بخت بھوت تھا۔ جس رات یہ واقعہ پیش آیا۔ ہمیں اس گھر میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ نیچے کے کمرے تو ہم نے جھاڑ پونچھ کر ٹھیک کر لیے تھے مگر اوپر کی

کوٹھڑی ویسے ہی چھوڑ دی تھی کہ پھر کبھی فرصت
میں اسے دیکھیں گے۔

وہ رات تو جوں توں کر کے کاٹی۔ صبح ہوئی،
تو ہم سب اُوپر پہنچے۔ ابّا جان نے کوٹھڑی کا
تالا کھولا۔ کواڑ بہت پُرانے تھے۔ اندر خُدا جانے
کیا کیا الا بلا بھری ہُوئی تھی۔ ابّا جان نے کہا کہ
اِس کوٹھڑی کی آج ہی صفائی ہونی چاہیے۔ مگر
امّی جان نے دُہائی مچا دی۔ بولیں "پہلے کسی مولوی
کو بُلا کر بھوتوں کو نکالو۔ پھر اِس کوٹھڑی کو ہاتھ
لگانا۔ اِن بھوتوں کا کیا بھروسا۔ ذرا سی دیر میں لاکھ
کا گھر خاک کر دیں۔"

ہوتے ہوتے یہ خبر سارے محلّے میں مشہور ہوگئی
پڑوس کی عورتیں اور بچّے ہمارے گھر آتے ہُوئے
گھبرانے لگے کہ کہیں بھوت انھیں نہ چمٹ جائیں۔
ابّا جان حیران تھے۔ آپا جان پریشان اور میرا اور
امّی جان کا مارے خوف کے بُرا حال تھا۔

آخر ابّا جان ایک مولوی صاحب کو لے آئے۔

مولوی صاحب نے ایک سفید مُرغا حلال کیا۔ ایک
سیر حلوا پکوا کر فاتحہ دی اور دس روپے نذرانہ لے
کر چلے گئے۔ رات کو ہم سب کوٹھے پر چڑھے اور
کان لگا کر سُنا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ پھر یکایک ہوا کا
ایک جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی اُوں اُوں
غرررر کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

صُبح ہُوئی تو ابّا جان پھر مولوی صاحب کو پکڑ لائے
اُنھوں نے پھر کچھ پڑھا پھُونکا اور پانچ سات روپے
لے کر چلتے بنے لیکن وہ آوازیں کسی صُورت بند

نہ ہُوئیں۔ آپا جان جل کر بولیں "اے امّی بھوت ووت

کوئی نہیں ہے کوئی اور ہی بات ہے۔" امّی جان
بولیں: "چند کتابیں پڑھ کر تیرا تو دماغ خراب ہو گیا
ہے۔ لو بیگم صاحبہ اب بھوتوں کو بھی نہیں مانتیں
میں کہتی ہوں یہ بہت بُری بلا ہوتی ہے۔
میرے ایک رِشتے کی پھوپھی کے ایک لڑکے کو
ایک بھوت چمٹ گیا تھا۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ
تُو ہر بلا سے بچانا۔ مرتے مر گیا مگر اس بھوت
نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔" آپا جان بولیں "اے
امّی وہ بھوت نہیں کوئی بھوتنی ہو گی۔" امّی جان
غصّے ہو کر بولیں: "لے چل نگوڑ ماری۔"

ہمارے سکول میں انگریزی کے ایک اُستاد تھے
ماسٹر خوشی محمّد جالندھری۔ ایک دن میں نے ان
سے اس بھوت کا ذکر کیا۔ بولے "میاں یہ جہالت
کی باتیں ہیں۔ بھوت پریت کوئی چیز نہیں۔" میں
نے کہا "ہمارے گھر کی ایک کوٹھڑی سے عجیب و
غریب آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی رو رہا ہے۔
جیسے کِسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔" بولے "ہشت۔

یہ سب تُمھارا وہم ہے۔" میں بولا "وہم نہیں ماسٹر
صاحب! آپ میرے ابّا سے پُوچھ لیجیے۔" ماسٹر صاحب
بولے "سچ مچ؟ بڑی عجیب بات ہے۔ اچھا آج
شام کو ہم تُمھارے گھر آئیں گے۔" میں نے
ماسٹر صاحب کو پتا بتا دیا اور وہ شام کے وقت
پہنچ گئے۔ میں انھیں لے کر چھت پر گیا۔ اس
وقت ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور کوٹھڑی میں
سے چیخنے چلّانے کی آواز بھی زور زور سے آ
رہی تھی۔ میں تو دُور کھڑا رہا۔ مگر ماسٹر صاحب
نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ آوازیں رُک گئیں
اُنھوں نے دروازہ بند کیا تو پھر آوازیں آنے
لگیں۔ اُنھوں نے غور سے دروازے کو دیکھا۔ اس
کی درزوں میں جھانکا اور کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔
میں نے پُوچھا "کیا بات ہے ماسٹر صاحب۔؟"
بولے "بھئی تُمھارا بھوت پکڑا گیا۔ لو دیکھو!
بھوت کواڑوں کی اِن جھرّیوں میں بند ہے۔"
میں نے غور سے دیکھا۔ کواڑوں کے شگاف بڑے

تھے - اور ان کے بیچ میں مکڑیوں نے موٹے موٹے جالے تان رکھے تھے۔

ماسٹر صاحب بولے "منّی میاں! اصل میں یہ سب ہوا کا کیا دھرا ہے۔ جب ہوا کواڑوں کی درزوں

یعنی شگافوں سے گزرتی ہے تو مکڑی کے جالوں سے ٹکراتی ہے اور یہ جالے قسم قسم کی آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ سمجھے؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ

جب ہم کواڑ بند کرتے ہیں تو آوازیں آتی ہیں۔ کھولتے ہیں تو رُک جاتی ہیں۔"

"ماسٹر صاحب! آپ کو دیکھ کر بھوت بھاگ جاتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ بولے "یہ بات ہے۔ اچھا تُم کاغذ سے ان تمام شگافوں کو بند کر دو۔ پھر دیکھو کیسے آوازیں آتی ہیں۔" میں نے ڈھیر سارا کاغذ اُٹھا لیا اور تمام جھرّیاں بند دیں۔ ماسٹر صاحب نے کواڑ بند کر دیے۔ ہم نے کافی دیر تک اِنتظار کیا مگر ایک آواز بھی نہ آئی۔ میرا حیرت کے مارے مُنھ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

شام کو ابّا جان آئے تو میں نے انھیں سارا

واقعہ سُنایا ۔ بہُت خوش ہُوئے ۔ آپا جان بولیں "وہ
مُلاّ نگوڑ مارا مُفت میں بیس پچیّس روپے کھا گیا۔
بھلا بھُوت ووت بھی کوئی چیز ہوتا ہے ؟"

راجا رانی

کِسی گاؤں میں ایک کِسان رہتا تھا ــ تھا تو
بے چارہ غریب مگر نام تھا راجا ۔ راجا کی ایک رانی
تھی ۔ اس کا نام تھا نُوراں ۔ اس کے دو بچّے تھے۔
ایک کا نام جُمّن تھا اور دُوسرے کا گھُمّن ۔ نُوراں
جِتنی نیک تھی ، اِتنی ہی خُوب صُورت بھی ۔ ہنستی
تو پھُول جھڑتے ، روتی تو موتی ۔ مگر وہ روتی کبھی
نہ تھی ۔ اِس لیے گھر میں پھُول تو تھے پر موتی نہ
تھے ۔

ایک دِن نُوراں بولی " ارے راجا ۔ ایک بات
کہُوں ـــ ؟"

راجا بولا: "کہو مگر ایک ہی کہنا۔"

نوراں بولی "سُن تو سہی یوں تو خُدا کا دیا سب کُچھ ہے۔ چھوٹا سا گھر۔ تھوڑی سی زمین۔ دو بیل۔ دو گائیں پر پلّے پیسا نہیں۔ جو تُو کماتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے۔ کُچھ جمع جتھا رکھنا بھی ضرُوری ہے کہ وقت پڑے تو کام آئے۔"

"پیسا کہاں سے لاؤں؟ ڈاکا ڈالوں؟" راجا نے پُوچھا۔

"توبہ کر توبہ" نوراں کانوں پہ ہاتھ دھر کے بولی۔ "ایسی بُری باتیں مُنھ سے نہیں نکالا کرتے۔ دیکھ تو ہمارے پاس دو گائیں ہیں۔ دو کی کیا ضرُورت ہے۔ ایک کو بیچ ڈال۔ جو پیسے ملیں گے۔ ہم انھیں سنبھال کر رکھ لیں گے۔"

راجا نے کُچھ دیر سوچا اور بولا۔ "بات تو ٹھیک ہے۔ بعض وقت تُو تُو میرے بھی کان کاٹنے لگتی ہے۔ لے میں ابھی منڈی جاتا ہُوں۔"

راجا نے گائے کھولی اور شہر لے گیا۔ شام
تک منڈی میں کھڑا رہا مگر کوئی بھی گاہک نہ آیا۔
سُورج ڈُوبنے کو ہُوا تو وہ گائے لے کر گھر کی
طرف چلا۔ تھوڑی دُور گیا ہو گا کہ ایک کِسان
ملا۔ جس کے پاس ایک گھوڑا تھا اور وہ اسے
بیچنا چاہتا تھا۔ راجا نے سوچا گائے تو میرے
پاس ہے پر گھوڑا کوئی نہیں۔ یہ سوچ کر اس
نے اپنی گائے اس کسان کو دے دی اور اس
کا گھوڑا خود لے لیا۔

کچھ دُور اور آگے چلا تو ایک دُوسرا کِسان
ملا۔ اس کے پاس ایک موٹی تازی بکری تھی۔
راجا نے اُسے گھوڑا دے کر بکری لے لی۔ کچھ دُور
جا کر اُسے ایک تیسرا شخص ملا جس کے پاس بھیڑ تھی
راجا کو وہ بھیڑ اِتنی اچھی لگی کہ اس نے بکری
دے کر بھیڑ لے لی۔

چند قدم آگے بڑھا ہو گا کہ اُسے چوتھا آدمی
ملا۔ اس کے پاس ایک مُرغا تھا۔ راجا نے سوچا

بھیڑ تو بالکل نکمّی ہوتی ہے۔ مُرغا بہت اچھا ہے۔ روز
صُبح سویرے بانگ دیتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس
نے بھیڑ اس شخص کو دے دی اور مُرغا خُود
لے لیا۔

اب گاؤں آدھی دُور رہ گیا۔ چلتے چلتے راجا
کے پیر تھک گئے اور مارے بھُوک کے پیٹ
میں چُوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ سامنے ایک قصبہ
تھا۔ وہ قصبے میں گیا۔ پیسے تھے نہیں کہ روٹی
خرید کر کھاتا۔ سوچا کیا کروں۔ یکایک بغل میں دبا
ہُوا مُرغا زور سے پھڑپھڑایا۔ اس نے سوچا۔
"ارے مُرغے کو تو میں بھُول ہی گیا۔ پیٹ کے
آگے مُرغے کی کیا حقیقت۔ کیوں نہ اِسے بیچ
ڈالوں؟"

اس نے مُرغا ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا اور
تنُور پر جا کر خُوب ڈٹ کر روٹی کھائی۔ پیٹ
میں روٹی گئی تو بدن میں جان آئی اور وہ
چاق و چوبند ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔

گاؤں میں گھسا ہی تھا کہ ساہوکار سے مٹھ بھیڑ
ہو گئی۔ اُس نے پوچھا "ارے راجا! تُو گائے
منڈی لے گیا تھا۔ سُنا کتنے میں بکی؟" راجا نے
کچھ دیر سوچا اور پھر ساری کہانی کہہ سُنائی۔ ساہوکار
بہت ہنسا۔ بولا "تجھ سا بے وقُوف بھی شاید کوئی
نہ ہو۔ بچُّو! اب تیری خیر نہیں۔ گھر ذرا سنبھل
کر جانا۔ بیوی وہ گت بنائے گی کہ عُمر بھر یاد
رکھے گا۔" راجا مُسکرا کر بولا "تُم میری بیوی کو
نہیں جانتے۔ وہ بہت نیک اور فرماں بردار عورت
ہے۔ میں چاہے کُچھ کروں کبھی مُجھے نہیں ٹوکتی۔"
"او ہو ہو ہو" ساہوکار نے قہقہہ لگایا۔ بچُّو! یہاں
جو چاہے کہہ لو۔ گھر جاؤ گے تو پتا چلے گا۔ میری
مانو۔ سر پر دو چار پگڑیاں اور لپیٹ لو تاکہ
کھوپڑی سلامت رہے۔"
راجا نے کہا "تمھیں میرا اِعتبار نہیں؟ اچھّا آؤ۔
میرے ساتھ چلو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"
ساہوکار بولا "چلتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔ اگر

تمھاری بیوی نے تمھیں کچھ نہ کہا تو میں تمھیں پُورے
سو روپے اِنعام دُوں گا۔ اور اگر وہ لڑی بھڑی
اور تمھیں صلواتیں سُنائیں تو تمھیں ایک مہینے میرے
کھیتوں میں مُفت کام کرنا پڑے گا۔ بولو منظُور
ہے؟"
"منظُور ہے۔" راجا نے جواب دیا۔ "مگر سو روپے
ساتھ لے لو۔ ایسا نہ ہو تمھیں واپس آنا پڑے۔"
ساہوکار لپک کے گھر گیا اور سو روپے تھیلی میں
ڈال کر لے آیا۔
اب دونوں گھر پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ امبو
دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور راجا نے دروازہ
کھٹ کھٹایا۔ نوراں دوڑی دوڑی آئی۔ ہاتھ میں
لالٹین تھی۔ دروازہ کھول کر لالٹین اُوپر اُٹھائی تو
راجا کا مُسکراتا ہُوا چہرہ جگ مگا اُٹھا۔ بولی:
"ارے! اِتنی دیر کر دی۔ کھانا رکھے رکھے ٹھنڈا
ہو گیا۔"
"کھانے کو چھوڑ" راجا نے کہا "یہ پُوچھ کہ گائے

کا کیا ہُوا ؟"

"کیا ہُوا ؟" نُوراں گھبرا گئی۔

راجا بولا " میں گائے منڈی لے گیا ۔ ۔ ۔"

"مجھے معلوم ہے ۔" نُوراں سر ہلا کر بولی۔

"اری ! پوری بات تو سُن ۔" راجا جلدی سے بولا
"میں گائے منڈی لے گیا مگر کوئی گاہک پاس تک
نہ پھٹکا ۔ اِس لیے میں نے اُسے گھوڑے سے
بدل لیا ۔"

"ارے یہ تو تُو نے بہُت اچھّا کیا ۔" نُوراں
خوش ہو کر بولی ۔" گائے تو ہمارے پاس ہے مگر

گھوڑا کوئی نہیں ۔ اب تُو اس پر چڑھ کر منڈی جایا
کرنا ۔ ارے او جُمّن ۔ ارے او گُھمّن ۔ جاؤ گھوڑا
چھپّر تلے باندھ دو ۔"

راجا جلدی سے بولا " اری نیک بخت سُن تو
سہی ۔ میں گھوڑا لے کر آگے بڑھا تو ایک بکری
والا مِل گیا ۔ میں نے اُسے گھوڑا دے کر بکری
لے لی ۔"

نُوراں خُوب ہنسی ۔ بولی " آہا ۔ یہ تو تُو نے بہُت
ہی اچھّا کیا ۔ تیری جگہ اگر میں ہوتی تو میں بھی
ایسا ہی کرتی ۔ گھوڑا تو من بھر چارہ روز کھاتا اور

پھر تو ایک غریب کسان۔ گھوڑے پر چڑھتا تو لوگ انگلیاں اٹھاتے۔ یہ تو تو نے اچھا کیا کہ بکری لے لی۔ بکری کا دودھ ہلکا ہوتا ہے اور جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ اب میں اپنے بچوں کو بکری کا ہی دودھ پلاؤں گی۔ ارے او جمّن ارے او گھمّن۔ جاؤ بکری کو چھپّر تلے باندھ دو۔"

"اررر۔ آگے تو سن۔" راجا بولا "میں بکری لے کر ذرا آگے بڑھا تو ایک بھیڑ والا مل گیا۔ میں نے وہ بکری اس کی بھیڑ سے بدل لی۔"

"واہ۔ وا" نوراں کھل کھلا کر بولی۔ "یہ تو تو نے اتنا اچھا کیا کہ بس جواب نہیں۔ بھلا بکری کا ہم کیا کرتے۔ دودھ کے لیے گائے تھوڑی ہے کیا۔ بھیڑ ہو گی تو اس کا اون کام آئے گا۔ میں اون کاتا کروں گی تو تو جا کر منڈی میں بیچ آیا کرنا۔ ارے او جمّن ارے او گھمّن۔ جاؤ بھیڑ کو چھپّر تلے باندھ دو۔"

"ہست تیرے کی" راجا سر پیٹ کر بولا "پوری

بات تو تو سنتی نہیں۔ میں بھیڑ لے کر آگے بڑھا تو ایک مرغی والا مل گیا۔ میں نے اسے بھیڑ دے کر ایک موٹا تازہ مرغا لے لیا۔"

"کیا کہا؟ مرغا لے لیا؟ ارے واہ" نوراں تالیاں بجا کر بولی "جگ جگ جیے میرا راجا بھلا سوچ تو سہی۔ بھیڑ بھی کوئی پالنے کی چیز ہے۔ دن بھر 'بیں بیں' کر کے گھر سر پر اٹھائے رکھتی۔ مرغا اچھا۔ صبح سویرے اذان دے گا تو ہم سب اٹھ جایا کریں گے۔ آج کل نہ جانے کیوں آنکھ دیر سے کھلتی ہے۔ ارے او جمّن ارے او گھمّن مرغے کو ٹوکری تلے بند کر دو۔ صبح کو میں ڈربا بنا دوں گی۔"

"اری خدا کی بندی" راجا بولا "پوری بات نہ سننے کی تو تو نے قسم کھائی ہے۔ ذرا آگے تو سن۔ میں مرغا لے کر گھر کی طرف چلا تو شام ہو گئی۔ بھوک نے بے حال کر دیا۔ راستے میں قصبہ آیا تو میں نے مرغا بیچ ڈالا اور خوب ڈٹ کر روٹی کھائی۔"

"لے ہے۔ تو اتنی دیر بھوکا رہا۔" نوراں سر پیٹ

کر بولی "میں نے کہا تھا کہ روٹی ساتھ لیتا جا۔ مگر
تو بھلا میری مانتا ہے۔ بھاڑ میں جائیں گائے اور
گھوڑا اور جہنم میں جائیں بھیڑ بکری۔ تو اندر چل یہاں
ٹھنڈ ہے۔ میں نے کریلے پیاز پکائے ہیں۔ کھائے
گا تو بس مزہ آ جائے گا۔"

راجا کی باچھیں کھل کر، کانوں سے جا لگیں۔
اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا "ارے میاں

ساہوکار۔ ارے بھئی سنتے ہو؟ ذرا اِدھر تو آؤ۔"
ساہوکار دیوار کی اوٹ سے باہر آیا۔ راجا نے پوچھا
"کون جیتا؟ میں کہ تم؟"

ساہوکار نے سر جھکا لیا۔

راجا بولا "یہ روپوں کی تھیلی ذرا مجھے پکڑا دو۔
معاف کرنا تمھیں تکلیف تو ہوگی۔"

ساہوکار نے کہا "نہیں بھائی۔ تکلیف کیسی۔ یہ تو
تمھارا انعام ہے۔ یہ لو۔"

باادب باملاحظہ ہوشیار

شاہی محل کے گھڑیال نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو باورچی خانہ کا دربان زور سے چیخا " باادب باملاحظہ ہوشیار ! شہنشاہوں کے شہنشاہ ۔ اعلیٰ حضرت فرمانروائے " اندھیر نگر " کھانا تناول فرمانے تشریف لاتے ہیں ۔"

خادموں نے کھانے کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور بادشاہ سلامت اپنی ملکہ کے ساتھ بڑی شان سے اندر داخل ہوئے ۔ کمرے کے بیچوں بیچ کھانے کی میز اس طرح چمک رہی تھی جیسے کسی گنجے کی تیل لگی کھوپڑی ۔ ملکہ نے پہلے تو اِدھر اُدھر

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پھر بادشاہ سلامت سے بولیں " اے حضور ! ہماری نظریں دھوکا کھا رہی ہیں یا سچ مچ کھانے کی میز کھانے سے خالی ہے ؟"

بادشاہ سلامت چیخ کر بولے " یہ کیا مذاق ہے؟ کہاں ہے باورچی خانے کا مینجر ؟ زندہ یا مردہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے ۔"

مینیجر میز کے نیچے سے باہر نکلا اور ہاتھ باندھ
کر بولا "ح ح حضور غلام حاضر ہے۔"
ملکہ بولیں "حاضر کا بچہ۔ کھا جاؤں گی کچا۔
بارہ بج گئے اور کھانا ابھی تک نہیں لگا؟"
مینیجر ہاتھ جوڑ کر بولا "حضور! جان کی امان
پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"
بادشاہ سلامت بولے "امان ہے۔ امان ہے۔
تمھاری سات پشتوں کو امان۔ جلدی بولو۔ مابدولت
کو بھوک لگ رہی ہے۔"
مینیجر بولا "اے حضور! باورچیوں نے ہڑتال کر
دی ہے۔ سب کے سب کام چھوڑ کر بھاگ گئے!"
ملکہ اچھل کر بولیں "بھاگ گئے؟ کیوں بھاگ
گئے؟ کہاں بھاگ گئے؟ کیسے بھاگ گئے؟"
مینیجر بولا "حضور! دو تو سائیکل پر چڑھ کر
بھاگ گئے۔ تیسرا پیدل رفو چکر ہو گیا اور چوتھا۔۔"
ملکہ پیر پٹخ کر بولیں "بے وقوف! ہم پوچھتے
ہیں کیوں بھاگ گئے؟"

مینیجر بولا "حضور! وہ کہتے تھے کہ ملکہ عالیہ نے
ہمارا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ ایک تو مرچیں بہت
زیادہ کھاتی ہیں۔ دوسرے کوڑی کوڑی کا حساب
لیتی ہیں اور کبھی ہم بھولے بھٹکے سودے میں
سے دو چار آنے کھا لیتے ہیں تو ہمیں چلچلاتی
دھوپ میں مرغا بنا دیتی ہیں۔ ایسی نوکری سے
ہم بھر پائے۔ ہم جانتے ہیں آج کی تنخواہ بھی
معاف ــــــ"
یہ سن کر ملکہ عالیہ نے اتنی غضب ناک صورت
صورت بنائی کہ بے چارہ مینیجر تھر تھر کانپنے لگا۔
محل کی دیواریں لرزنے لگیں اور گھنٹا چلتے چلتے
ایک دم رک گیا۔ نتھنے پھلا کر بولیں "سن رہے
ہیں بادشاہ سلامت؟ ـــ ان نمک حراموں کو
ایسی خوف ناک سزا دیں کہ ان کی سات پشتیں
یاد رکھیں۔"
بادشاہ سلامت زور سے کڑکے "ارے کوئی
ہے؟ ـــ وزیر اعظم کو زندہ یا مردہ فوراً ہمارے

سامنے پیش کیا جائے۔"

تھوڑی دیر بعد وزیرِ اعظم صاحب کانپتے لرزتے کمرے میں آئے اور ہاتھ باندھ کر بولے "جہاں پناہ! غلام حاضر ہے۔"

بادشاہ سلامت بولے "سنو! ہمارا حکم غور سے سنو! شہر میں جتنے باورچی ہیں۔ زندہ یا مُردہ سب کو فوراً پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔"

وزیرِ اعظم صاحب نے جھک کر تین سلام کیے۔ اور اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

بادشاہ سلامت پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولے "اب کیا ہو گا؟ مابدولت کا تو بھوک کے مارے بُرا حال ہے۔ کیوں نہ آج کسی ہوٹل میں کھانا کھایا جائے۔"

ملکہ گردن اکڑا کر بولیں "نہیں، آج ہم خود کھانا پکائیں گے تاکہ ہماری رعایا کو معلوم ہو کہ بادشاہ کام چور اور نکمے نہیں ہوتے۔ وہ کام کرنا بھی جانتے ہیں۔ آیئے۔ باورچی خانے میں چلیں۔"

دربان نے باورچی خانے کا دروازہ کھول دیا۔ اور زور سے چیخا "با ادب با ملاحظہ ہوشیار! شہنشاہوں کے شہنشاہ اعلیٰ حضرت اندھیر نگر کھانا پکانے تشریف لاتے ہیں۔"

ملکہ بولیں "کھانا تو میں پکا لوں گی لیکن حضور کو بھی کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے۔ فرمایئے۔ آپ میری کیا مدد فرما سکتے ہیں؟"

بادشاہ سلامت بولے "ہم کھانا ختم کرنے میں آپ کی مدد فرما سکتے ہیں۔"

ملکہ غصے ہو کر بولیں "جہاں پناہ! یہ کیا فرما رہے ہیں۔ ملکہ کھانا پکائیں گی تو آپ کو بھی ان کا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ چلیے آپ چولھا سلگایئے۔ میں ترکاری کاٹتی ہوں۔"

یہ حکم سُن کر بادشاہ سلامت نے مجبوراً وہ چغہ پہنا جسے پہن کر شاہی باورچی کھانا پکاتے ہیں۔ بدقسمتی سے بادشاہ سلامت کا قد بہت چھوٹا تھا اور چغہ بہت بڑا۔ آپ سر سے پیر تک اس

چُغے میں چھپ گئے اور بالکل ایسے معلوم ہونے
لگے جیسے کوئی مُردہ قبرستان سے اُٹھ کر بھاگ آیا ہو۔
اب بادشاہ سلامت تو چلے چُولھا پھونکنے اور
ملکہ عالیہ نے ترکاری کے لیے نعمت خانے کا پٹ
کھولا۔ سارا نعمت خانہ چھان مارا مگر سوائے ایک
ٹوٹے ہوئے انڈے اور ایک سڑے ہوئے آلو کے
اور کچھ نہ ملا۔ بہت جھلائیں۔ نوکروں کو آواز دینا
چاہتی ہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور دربان اندر
آ کر بولا:

"حضور! مُورکھ نگر کے راجا۔ مہاراج ادھیراج
بھوج اور مہارانی چندر متی پدمنی بے ہوش تشریف
لائی ہیں۔"

ملکہ خوش ہو کر بولیں "سُنتے ہیں جہاں پناہ!
مہاراج تشریف لائے ہیں۔" جہاں پناہ بولے:
"سُنیں کیا خاک؟ چُولھا پھونکتے پھونکتے
مابدولت کی ناک جل گئی۔ جاؤ! انھیں ملاقاتی کمرے
میں بٹھاؤ۔ کہنا بادشاہ سلامت چُولھا جلا کر ابھی

تشریف لاتے ہیں۔"

ملکہ بولیں "حضور بھی کمال کرتے ہیں۔ مہاراج سُنیں
گے تو کیا کہیں گے۔ کبھی عقل سے بھی کام لیا کیجیے۔"
بادشاہ سلامت توند پر ہاتھ پھیر کر بولے "عقل
ہوتی تو کوئی کام کرتے۔ بادشاہی کاہے کو کرتے۔"
ملکہ سُنی اَن سُنی کر کے بولیں "حضور جا کر ان کا
استقبال کریں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

کچھ تو بھوک اور کچھ مہاراج کی آمد۔ اِن سب
باتوں نے بادشاہ سلامت کو گھبرا دیا اور آپ باورچیوں
والا چغہ پہنے ہوئے ہی مہاراج سے ملنے چل کھڑے
ہوئے لیکن جب مُلاقاتی کمرے کی سیڑھیاں اُترنے
لگے تو دامن پیروں میں اُلجھ گیا اور آپ قلابازیاں
کھاتے ہوئے مہاراج کے قدموں میں جا گرے۔

مہارانی بے ہوش موٹر میں سے اپنا بٹوہ لینے گئی
ہوئی تھیں۔ مہاراج کمرے میں اکیلے تھے۔ وہ
بے چارے سیدھے سادے، سمجھے کہ بادشاہ سلامت
نے ان کے بیٹھنے کے لیے گاؤ تکیہ بھیجا ہے۔ یہ

سوچ کر وہ جھٹ بادشاہ سلامت پر چڑھ کر بیٹھ
گئے ۔ بادشاہ سلامت نے جو یہ آفت اپنے اُوپر
نازل ہوتے دیکھی تو اُٹھنے کے لیے زور لگایا ۔
اس گڑبڑ میں دونوں چُغے میں لپٹ گئے اور لڑھکتے
ہوئے صوفے کے نیچے جا گھسے ۔ ادھر تو یہ تماشا
ہو رہا تھا اور اُدھر ملکۂ عالم بن سنور کر مہارانی
چندرمتی پدمنی بے ہوش کے ساتھ اندر تشریف

لائیں ۔ مگر جب کمرہ خالی دیکھا تو بہت حیران
ہوئیں ۔ بولیں "ارے ! یہ جہاں پناہ اور مہاراج
کہاں چلے گئے ؟"
مہارانی بولیں "شاید باغ میں ہوں ۔ میں تو تھک
گئی ہوں ۔ تھوڑی دیر بیٹھوں گی ۔ آپ ہی آجائیں
گے ۔"
یہ کہہ کر مہارانی اسی صوفے پر بیٹھ گئیں ، جس

کے نیچے بادشاہ سلامت اور مہاراج کشتی لڑ رہے
تھے مگر ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ
کہ نیچے سے بادشاہ سلامت چیخ کر بولے" ارے
میرا سر۔۔۔ اُف میرا سر ٹوٹا۔" مہارانی ایک دم
اُچھل پڑیں اور حیران ہو کر صوفے کو دیکھنے لگیں کہ
اِتنے میں مہاراج پُکارے" ارے کوئی بادشاہ سلامت
کو بُلاؤ۔ یہ بھوت میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔" ملکۂ عالم
اور مہارانی یہ چیخیں سُن کر گھبرا گئیں اور بے تحاشا
شور مچاتے لگیں۔

اب یہ حالت تھی کہ مہاراج بادشاہ سلامت
سے پیچھا چھڑاتے کی لاکھ کوشش کریں مگر پھنسے
میں اِس بُری طرح اُلجھ گئے تھے کہ کسی طرح الگ
ہی نہ ہوتے تھے۔ اس گتھم گتھا اور دھکم دھکا
کی وجہ سے صوفہ سارے کمرے میں ناچا ناچا
پھر رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور دربان اندر
داخل ہوا۔ اس نے جو صوفے کو کمرے میں چکر
لگاتے دیکھا تو بھوت بھوت کہہ کر بھاگنے لگا۔

ملکۂ عالم ڈانٹ کر بولیں "کم بخت! دیکھ تو یہ
کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔" ملکۂ عالم کی ڈانٹ سے
دربان ٹھہر گیا اور اس نے صوفہ اُلٹ کر بادشاہ
سلامت اور مہاراج کو علیحدہ کیا۔ اب دونوں
سُورماؤں کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔
بادشاہ سلامت کا چُغہ پھٹ پھٹا کر برابر ہو گیا
تھا۔ صرف ایک دھجّی گلے میں لٹک رہی تھی۔ پاجامے
کا ایک پائینچہ مہاراج کھا گئے تھے اور دوسرا
دِھینگا مُشتی میں اُوپر چڑھ گیا تھا۔ مہاراج کو دیکھ
کر تو۔ سرکس کے کسی مسخرے کا دھوکا ہوتا تھا۔
تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو گھورتے
رہے پھر مہاراج بولے" ارے جہاں پناہ آپ؟"
اور بادشاہ سلامت پیٹھ سہلا کر بولے" کوئی بات
نہیں مہاراج! غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کو
کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"
مہاراج کراہتے ہوئے بولے" جی نہیں حضور!
صرف ذرا سی ناک پچ گئی ہے۔"

بادشاہ سلامت غصّے سے بولے "یہ سب اس چُغّے کا قصُور ہے۔ ۔۔ ۔۔"

مہاراج نے کہا "جی ہاں۔ لیکن حضور! آپ نے یہ چُغہ پہنا ہی کیوں تھا؟"

بادشاہ سلامت کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ دربان نے آکر عرض کی "حضُور! کھانا تیار ہے۔"

"کھانا ــــ؟" بادشاہ سلامت نے حیرت سے کہا۔

"کھانا ــــ؟" ملکہ نے تعجب سے پُوچھا۔

"جی ہاں حضُور!" دربان نے سر جُھکا کر کہا۔ "باورچی کام پر واپس آگئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ حضور معاف فرمائیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" ملکہ تن فن کر بولیں۔ "بادشاہ سلامت کا حُکم ہے کہ تمام باورچیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔"

بادشاہ سلامت جلدی سے بولے "ملکۂ عالم! صبح سے ہم بھی بھُوکے ہیں اور آپ بھی۔ پھر مہاراج بھی آج ہمارے مہمان ہیں۔ ہماری رائے میں باورچیوں کا قصُور معاف فرما دیا جائے۔ کیوں مہارانی صاحبہ؟"

مہارانی مٹک کے بولیں "اے حضُور! صدقے جاؤں۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔"

بادشاہ سلامت نے کڑک کے حُکم دیا "کھانا میز پر لگایا جائے۔ آج ہم یعنی اعلیٰ حضرت حضُور پُرنور شاہِ اندھیر نگر مہاراج ادھیراج بھوج اور مہارانی چندر متی پدمنی بے ہوش کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں گے۔"

واہ رے عقل مند!

ایک بادشاہ کو اپنی عقل مندی پر بہت ناز تھا
اس کا خیال تھا کہ وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہے
اور دُنیا میں کوئی شخص اسے بے وقوف نہیں بنا
سکتا۔ ایک دن اس نے دربار میں اکڑ کر کہا "خدا
نے ہم جیسا عقل مند اور سمجھ دار شخص آج تک
پیدا نہیں کیا۔ اگر کوئی ہے تو وہ سامنے آئے۔
اگر اس نے ہمیں بے وقوف بنا دیا تو ہم اسے
دس لاکھ روپیہ اِنعام دیں گے لیکن اگر وہ ہار
گیا تو اس کی گردن مار دی جائے گی۔"
انعام کا سُن کر بہت سے لوگوں کا من للچایا

مگر گردن مارے جانے کے خوف سے خاموش ہو
رہے۔ آخر ایک دیہاتی نے ہمت کی وہ دربار میں
پہنچا اور بولا "جہاں پناہ! میرا نام شکرو ہے میں
موضع چار سو بیس تحصیل دھوکا پور ضلع فریب نگر
کا رہنے والا ہوں۔ چال بازی اور دھوکا بازی
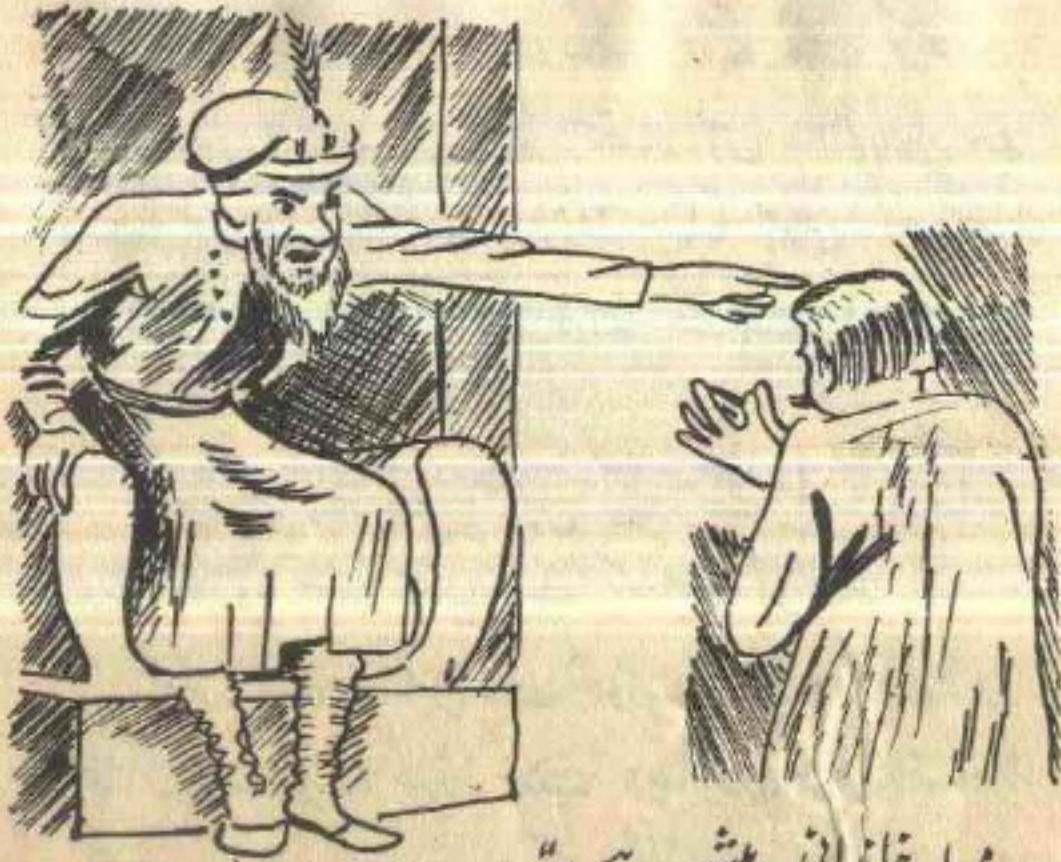
میرا خاندانی پیشہ ہے۔"
"خوب خوب!" بادشاہ بولا "اگر تم نے اپنی چالبازی
سے ہمیں بے وقوف بنا دیا تو ہم تمہیں دس لاکھ روپے

دیں گے۔ لیکن اگر ہار گئے تو تمھاری گردن مروڑ دی جائے گی۔ منظور ہے؟"

"منظور ہے۔ جہاں پناہ!" شکرو نے سر جھکا کر جواب دیا "مگر حضور میں اپنے ہتھیار گھر چھوڑ آیا ہوں اگر حضور اجازت دیں تو لے آؤں۔"

"ہتھیار کیسے؟" بادشاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"حضور میرے پاس کچھ ہتھیار ہیں۔ انھی کی مدد سے میں لوگوں کو بے وقوف بناتا ہوں۔ وہ ہتھیار بہت وزنی ہیں۔ انھیں لانے کے لیے کم سے کم ایک سو گھوڑے چاہییں۔"

"گھوڑے ہمارے اصطبل سے لے لو۔" بادشاہ نے حکم دیا "اور ہتھیار لے کر جلد آؤ۔"

شکرو نے اصطبل سے گھوڑے لیے اور گاؤں جا کر ایک ایک گھوڑا سب دیہاتیوں میں بانٹ دیا۔ تھوڑے دن بعد وہ دو تین گاڑیوں میں بہت سا کاٹھ کباڑ بھر کر شاہی محل میں گیا۔ بادشاہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "ہتھیار لے آئے؟"

شکرو نے جواب دیا "جی ہاں حضور!"

اتنے میں بادشاہ کا کتا بھاگتا ہوا آیا اور شکرو کی ٹانگ سونگھنے لگا۔ شکرو نے اس کے منھ سے کان لگایا اور ایک دم چیخ کر بولا "حضور غضب ہو گیا۔ ستم ہو گیا۔ میری بیوی سخت بیمار ہے۔ اُف میں کیا کروں۔ اسے کون دوا لا کر دے گا۔ ہائے ــــ ہائے ــــ"
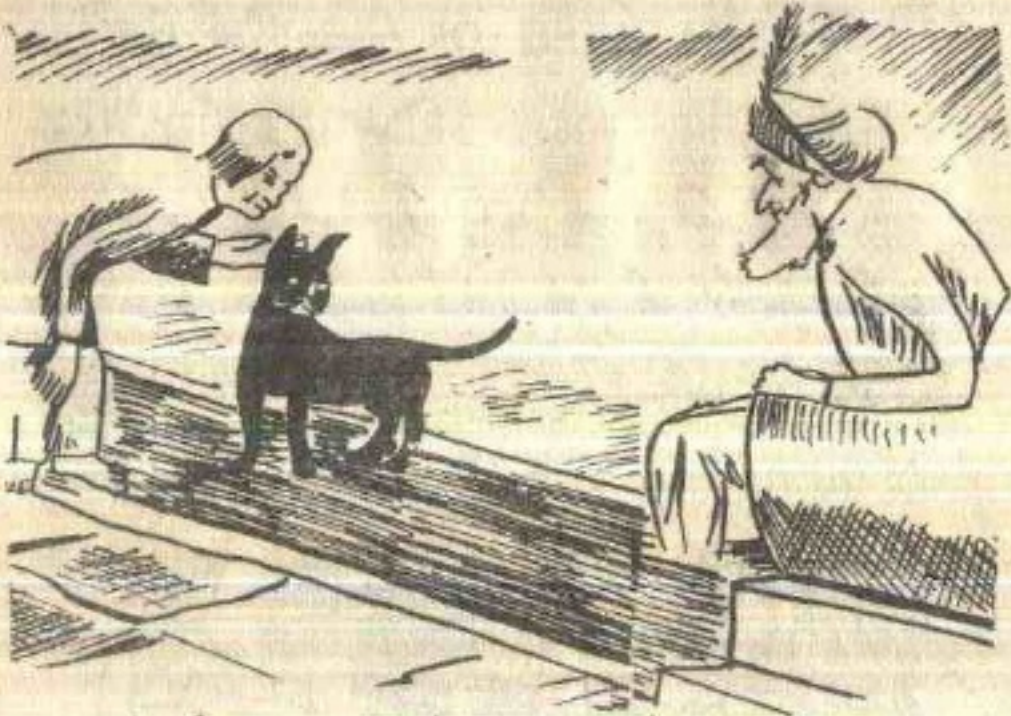
"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ تمھاری بیوی بیمار ہو گئی ہے؟" بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"حضُور کے کُتّے نے ابھی ابھی مجھے بنایا ہے۔" شکرو
نے جواب دیا۔

بادشاہ کو بہت افسوس ہُوا۔ بولا۔ "جاؤ اصطبل سے
ہمارا عربی گھوڑا لے لو اور بیوی کی دوا دارُو کا
بندوبست کر کے جلد آؤ۔"

شکرو نے گھوڑا تو ایک سوداگر کے ہاتھ بیچا اور
ایک مریل سا گدھا گدھا خرید کر دُوسرے دن
دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے گدھا دیکھا اور چونک کر
بولا "وہ ہمارا گھوڑا کہاں گیا؟"

شکرو نے کہا "جہاں پناہ! وہ گھوڑا تھا کہ کوئی جن۔
چلتے چلتے ایک دم گدھا بن گیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بادشاہ غُصّے ہو کر بولا۔
"وہ گھوڑا پانچ سال سے ہمارے پاس تھا اور کبھی
گدھا نہیں بنا۔"

"حضور مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ہے یہ سچ بات۔"
شکرو نے کہا۔ "دیکھیے وُہی لگام ہے۔ وہی کاٹھی
ہے اور گدھے کا رنگ بھی گھوڑے جیسا ہے۔"

بادشاہ بولا "بڑے تعجّب کی بات ہے۔ اچھّا خیر
کوئی بات نہیں۔ اب تُم کوئی ایسی چال چلو کہ ہم
دھوکا کھا جائیں۔"

شکرو مُسکرایا اور بولا "حضُور چاہیں تو میں چل
چُکا۔ میں نے حضُور کو تین دفعہ بے وقوف بنایا ہے"

بادشاہ سٹ پٹا کر بولا "ہمیں بے وقوف بنایا؟
کِس طرح؟"

شکرو نے کہا "حضُور پہلے میرے تین سوالوں کے
جواب دیں۔"

"پہلا سوال: کیا حضُور نے کبھی کِسی کو بے وقوف
بنانے کے لیے کوئی ہتھیار اِستعمال کیا؟"

"نہیں" بادشاہ نے جواب دیا۔

"تو پھر میں کس طرح کر سکتا تھا؟" شکرو نے کہا۔ "یہ میری پہلی چال تھی اور حضور میرے پھانسے میں آ گئے۔"

"دُوسرا سوال: حضور نے کبھی اپنے کتّے کو باتیں کرتے سُنا؟"

"نہیں ـــ" بادشاہ نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ میرے ساتھ کیسے بات کر سکتا تھا؟" شکرو بولا "یہ میری دوسری چال تھی اور حضور دھوکے میں آ گئے۔"

"تیسرا سوال: حضور نے کبھی کسی گھوڑے کو گدھا بنتے دیکھا ہے؟"

"نہیں ـــ" بادشاہ نے جواب دیا۔

"تو پھر حضور کا گھوڑا کس طرح گدھا بن سکتا تھا؟" شکرو نے کہا "یہ میری تیسری چال تھی۔ میں نے حضور کو ایک دفعہ نہیں تین دفعہ بے وقوف بنایا۔ اب حضور اپنا وعدہ پورا کریں۔"

بادشاہ نے سر جُھکا لیا۔ تمام درباری مُنہ نیچے کیے ہنس رہے تھے۔ بادشاہ نے شکرو کو دس لاکھ روپیہ دیا اور پھر کبھی بڑا بول نہیں بولا۔

آہا ہا ہا

خدا معلوم سچ یا جھوٹ۔ کہتے ہیں افریقہ میں ایک
چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں عجیب عجیب باتیں
ہوتی تھیں۔ ایک دن ایک کسان اپنے کھیت میں
نلائی کر رہا تھا کہ ایک آلو زور سے چیخ کر بولا:
"کسان کے بچے۔ آہستہ آہستہ کھرپی چلا۔ تو نے تو
مجھے زخمی کر دیا۔ اُف۔"

کسان بڑا حیران ہوا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
سر کھجایا اور گائے کی طرف دیکھ کر بولا "تو نے
کچھ کہا۔؟" گائے جگالی کر رہی تھی۔ آہستہ سے بولی
"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" کتا بولا "آلو کہتا تھا

آہستہ آہستہ کھرپی چلا۔"

اب تو کسان کی سٹی گم ہو گئی۔ ڈر کے مارے
تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے گھبرا کر کھرپی زمین پر
پٹخی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک جُلاہا مِلا،
جو سر پر کپڑوں کی گٹھڑی رکھے شہر جا رہا تھا۔
کسان کو بھاگتا ہوا دیکھا تو آواز دی" ارے بھائی!
ذرا ٹھہرنا۔ یہ دیوانوں کی طرح کیوں بھاگ رہے ہو۔
ایسی کون سی مصیبت آ گئی؟"

کِسان ہانپتا ہُوا بولا "کیا بتاؤں میں اپنے کھیت میں نلائی کر رہا تھا کہ آلُو بولا "کسان کے بچّے۔ آہستہ آہِستہ کھُرپی چلا۔ تُو نے مجھے زخمی کر دیا۔ اُف۔" میں نے گائے سے پُوچھا "تُو نے کچھ کہا؟" گائے بولی "میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" پھر میرا کُتّا بولا "آلُو کہتا ہے آہِستہ آہِستہ کھُرپی چلا۔"

"آہاہاہا" جولاہے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ بولا "ارے عقل کے اندھے۔ کہیں بے زبان بھی باتیں کرتے ہیں۔ جا۔ جا کر اپنے سر کی مالش کرا۔" یکایک جولاہے کی گٹھڑی ہلی اور اس میں سے آواز آئی "اِتنی زور سے نہ ہنس۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

جولاہے نے گھبرا کر گٹھڑی نیچے پھینک دی اور اب دونوں بے تحاشا بھاگنے لگے۔ تھوڑی دُور جا کر انھیں ایک مچھیرا مِلا، جو کندھے پر جال رکھے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو روک کر پُوچھا "خیر تو ہے۔ بگٹٹ کیوں بھاگے جا

رہے ہو۔ کوئی شیر پیچھے لگ گیا ہے؟"

کِسان نے تھوڑا دم لیا۔ پھُولی ہُوئی سانس ٹھیک کی اور پھر بولا "ارے بھیّا۔ غضب ہو گیا۔ میں اپنے کھیت کی نلائی کر رہا تھا کہ ایک آلُو بولا "آہِستہ آہِستہ کھرپی چلا۔ تُو نے تو مجھے زخمی کر دیا۔ اُف۔" میں نے گائے سے پُوچھا "تُو نے کچھ کہا؟" گائے نے کہا "میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" کُتّا بولا "آلُو نے کہا تھا کہ آہِستہ آہِستہ کھُرپی چلا۔"
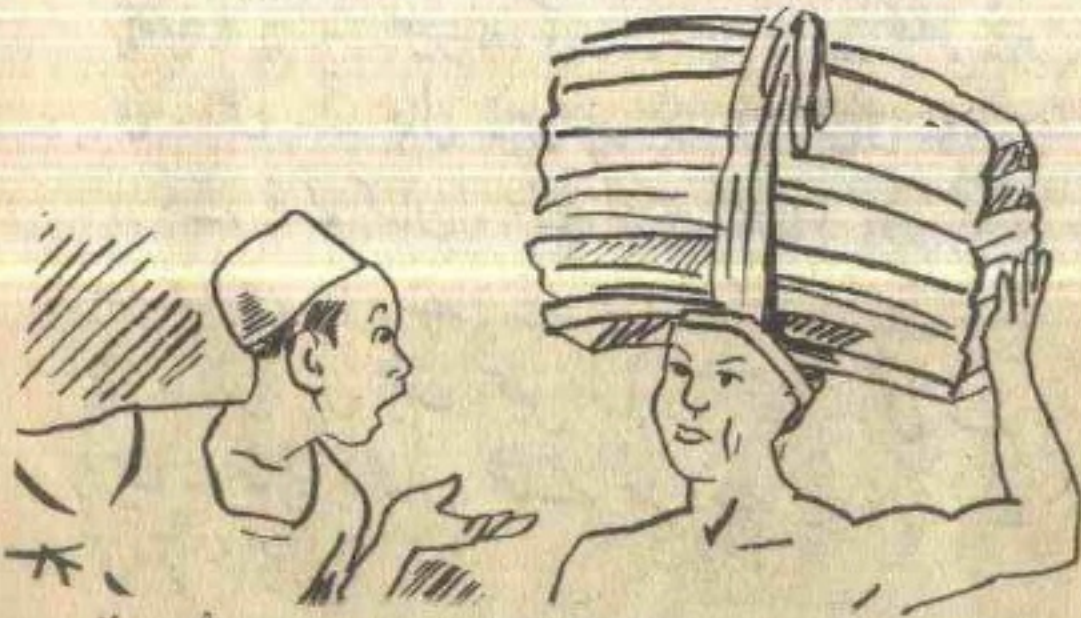
جولاہا بولا "میں نے کِسان کی یہ بات سُنی تو ہنسی آ گئی۔ جانتے ہو پھر کیا ہُوا؟ میری گٹھڑی

بولی "اِتنی زور سے نہ ہنس ۔ میری طبیعت خراب
ہے"

مچھیرے نے غور سے اُن کی صورت دیکھی اور مُسکرا
کر بولا "اور اب تم کہاں جا رہے ہو؟"
کسان بولا "ہم گاؤں جا رہے ہیں۔"
مچھیرے نے کہا "گاؤں نہ جاؤ شہر جاؤ۔ وہاں
بہت بڑا پاگل خانہ ہے ۔ ہا ہا ہا ہا"
"تجھے کیا۔" مچھیرے کا جال بولا ۔ "تُو چل کے
مچھلیاں پکڑ ۔" مچھیرے کی ڈر کے مارے گِھگھی بندھ
گئی ۔ اس نے جال زمین پر پٹخا اور بھاگ کھڑا ہوا۔
آگے آگے کسان ۔ پیچھے پیچھے جولاہا اور مچھیرا۔
بھاگے چلے جا رہے تھے ۔ راستے میں ایک دریا
پڑا ۔ دریا میں ایک شخص نہا رہا تھا ۔ اس نے
پُوچھا "بھائیو! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ کچھ مجھے
بھی تو بتاؤ۔"

کسان نے کہا "بھائی کیا بتاؤں ۔ میں کھیت میں
نلائی کر رہا تھا کہ ایک آلو بولا "آہستہ آہستہ کھرپی

چلا ۔ تُو نے تو مجھے زخمی کر دیا ۔ اُف ۔" میں نے
گائے سے پُوچھا "تُو نے کچھ کہا؟" گائے بولی
"میں نے تو کچھ نہیں کہا ۔" میرا کتا بولا "آلو نے
کہا تھا آہستہ کھرپی چلا ۔"

"اور پھر میرے بھائی ۔" جولاہا بولا "میں نے یہ
یہ واقعہ سُنا تو بہت ہنسا ۔ یکایک میری گٹھڑی
ہِلی اور اُس میں سے آواز آئی "اِتنی زور سے نہ
ہنس ۔ میری طبیعت خراب ہے ۔"
"بالکل یہی واقعہ میرے ساتھ بھی ہُوا ۔" مچھیرا چلّا
کر بولا "میں نے یہ کہانی سُنی تو زور کا قہقہہ لگایا
اور پھر —"
"پھر کیا ہُوا؟" اس شخص نے پُوچھا ۔
"پھر یہ ہُوا میرے بھائی ۔" مچھیرے نے اِدھر اُدھر
دیکھ کر کہا "میرا جال زور سے ہِلا اور بولا "تجھے
کیا ۔ تُو چل کے مچھلیاں پکڑ ۔" "ہو ہو ہو ہو ۔" وہ شخص
ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا ۔ "جاؤ ۔ کسی اور کو بے وقوف
بناؤ ۔ میں تمھاری باتوں میں آنے والا نہیں ۔" ایکا ایکی

دریا میں ایک لہر اُٹھی اور اس لہر میں سے آواز
آئی "جلدی باہر نِکل کر کپڑے پہن لے ورنہ سردی
لگ جائے گی۔"

وہ آدمی ہڑبڑا کر باہر نکلا اور اُلٹے سیدھے
کپڑے پہن کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کسان،
جولاہا اور مچھیرا بھی پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔
اب گاؤں آ گیا تھا۔ چاروں بھاگتے ہوئے سردار کے

پاس پہنچے اور کسان بولا:
"حضور غضب ہو گیا۔ دُہائی ہے۔ فریاد......"
سردار ڈانٹ کر بولا "بکو مت۔ صاف صاف بتاؤ
کیا معاملہ ہے؟"

کِسان نے کہا "حضور میں اپنے کھیت میں
نلائی کر رہا تھا کہ ایک آلو بولا "آہستہ آہستہ
کھرپی چلا۔ تُو نے تو مجھے زخمی کر دیا۔" میں نے

حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ گائے سے پوچھا "تُو نے کچھ کہا۔؟" تو وہ بولی "میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" کُتّے نے کہا "آلو نے کہا تھا "آہستہ آہستہ کھُرپی چلا۔" بس حضور یہ سُنتا تھا کہ میرے تو اوسان خطا ہو گئے اور میں وہاں سے بے تحاشا بھاگا۔"

"اور حضور!" جولاہا بولا "میں نے یہ کہانی سُنی تو مجھے بہت ہنسی آئی۔ حضور شاید یقین نہ کریں۔ میرے سر پر کپڑوں کی گٹھڑی تھی۔ وہ گٹھڑی مجھ سے بولی "اِتنی زور سے نہ ہنس۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

مچھیرے نے گلا صاف کیا اور بولا "یہ باتیں بھلا ماننے والی ہیں۔ ان لوگوں نے یہ واقعہ مجھے سُنایا تو میں نے بھی یقین نہیں کیا۔ مگر یکایک میرے جال میں حرکت ہوئی اور وہ بولا "تجھے کیا تُو چل کر مچھلیاں پکڑ۔"

دریا میں نہانے والے آدمی نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولا "حضور یہی بات میرے ساتھ ہوئی۔ میں دریا میں نہا رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنی کہانی سُنا رہے تھے۔ یکایک ایک لہر آئی اور بولی: "جلدی باہر نکل اور کپڑے پہن۔ ورنہ سردی لگ جائے گی۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" سردار غُصّے سے چیخ کر بولا۔ "یا تو میں پاگل ہوں اور یا تم لوگ۔"

ایکا ایکی سردار کا اسٹول ہلا اور زور سے بولا "نہ تم پاگل ہو اور نہ یہ لوگ۔ میں پاگل ہوں۔ ہا ہا ہا۔"

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

جنگل کا بادشاہ
ٹارزن
بچوں کے لیے
نہایت ہی دل چسپ ناول
ٹارزن انسان کا بچہ تھا۔ مگر اسے افریقہ کے ہیبت ناک
جنگلوں میں گوریلوں نے پالا پوسا تھا۔ لوگ اسے گوریلا ہی سمجھتے تھے۔
وہ اتنا طاقت ور تھا کہ بڑے سے بڑے شیر کی گردن چوہے کی
طرح مروڑ دیتا تھا۔ بھوت ناک سے خوف ناک ہاتھی کو پل بھر میں بے بس
کر دیتا تھا۔ آدم خور وحشی انسان اس کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے۔
یہ ناول
اسی بہادر اور دلیر ٹارزن کے
حیرت انگیز کارناموں کی داستان ہے
اس کے چار حصے ہیں
ٹارزن
ٹارزن کی واپسی
ٹارزن اور درندے
ٹارزن کا بیٹا
ایسے دل چسپ ناول آپ نے پہلے کبھی نہیں پڑھے ہوں گے۔
ہر حصے کی قیمت:
فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

دِل چسپ کہانیاں

کتاب	تفصیل
سنہری مکھ شہزادہ	نہایت دِل چسپ اور سبق آموز کہانیاں۔ زبان بہت آسان اور سلیس۔ جگہ جگہ تصویریں۔
حافظ جی	سعید لخت کی ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دینے والی ۱۴ کہانیاں۔ رنگین کارٹون اور تصویریں۔
جان جوکھوں کی کہانیاں	جبار توقیر کی دِل چسپ اور ہمّت و جُرأت کے کارناموں سے بھر پُور کہانیاں۔ خُوب صُورت تصویروں کے ساتھ۔
شکار کی کہانیاں	افریقہ کے خوفناک درندوں کے شکار کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات مقبُول جہانگیر کے قلم سے۔
ہنسی کی کہانیاں	حسن عابدی، سعید لخت اور دُوسرے ادیبوں کی مزاحیہ کہانیاں ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔
بڑا آدمی	احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب جیسے نامی ادیبوں کی دِل چسپ کہانیاں۔ بڑا سائز۔ دِل کش تصویریں۔
پانچ موتی	موتیوں کی طرح چمکتی دمکتی دِل چسپ اور مزیدار کہانیوں کا مجمُوعہ خوب صُورت لکھائی چھپائی۔ جگہ جگہ تصویریں۔
انوکھی کہانیاں	مشہور ادیب سیّد قاسم محمود کی لکھی ہوئی دِل چسپ اور حیرت انگیز کہانیاں۔ تصویروں کے ساتھ
وہ کون تھا؟	اس کتاب میں بچّوں کے مشہور ادیبوں کی دس بہترین کہانیاں شامل ہیں۔ جگہ جگہ تصویریں۔

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور، راولپنڈی، کراچی
Rs. 3.00

www.paknovels.com
حافظ جی
سعید لخت

کہانیاں

حافِظ جی

ایک دِن جب ہم نے بی پڑوسن کا گھڑا غُلّا مار کر توڑ دیا تو بڑی گڑبڑ مچی۔ ابّا جان شام کو گھر آئے تو امّی بولیں "اے، مَیں نے کہا سُنتے ہو؟ اپنے لاڈلے کے کچھن تو دیکھو۔ اس نے تو سارا محلّہ سر پر اُٹھا رکھا ہے۔"

ابّا جان بولے "لاحولَ ولا قُوّۃ۔ حد کر دی۔ اتنا سا بچہ محلّہ کیسے اُٹھا سکتا ہے۔"

امّی بولیں "اے، تمہیں تو سُوجھتا ہے مذاق۔ میں کہتی ہُوں، اللہ رکھے اب یہ پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ اب اِس کی پڑھائی کا بھی تو کچھ بندوبست کرو۔ یہ کب تک یُونہی مارا مارا پھرتا پھرے گا؟"

"جی ہاں، حضور" دربان سے سر جھکا کر کہا۔ "باورچی کام پر واپس آ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔ حضور مُعاف فرمائیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" ملکہ تن فن ہو کر بولیں "بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ تمام باورچیوں کو پھانسی دے دی جائے۔"

بادشاہ سلامت جلدی سے بولے "ملکہءِ عالیہ! صبح سے ہم بھی بھوکے ہیں اور آپ بھی۔ پھر مہاراج بھی آج ہمارے مہمان ہیں۔ ہماری رائے میں باورچیوں کا قصور معاف فرما دیا جائے۔ کیوں مہارانی صاحبہ؟"

مہارانی مٹک کے بولیں "اے حضور، صدقے جاؤں۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔"

بادشاہ سلامت نے کڑک کے حکم دیا "کھانا لگایا جائے۔ آج ہم یعنی اعلیٰ حضرت حضور پُرنور شاہ اندھیر نگر مہاراج اُدھیراج بھوج اور مہارانی چندر متی پدمنی بے ہوش کے ساتھ کھانا تناوُل فرمائیں گے۔"

موچی بن گیا کھوجی

شہر بغداد کے محلہ جیلان میں ایک موچی رہتا تھا، نام تھا حارث بن وارث۔ بہت صابر اور شاکر آدمی تھا لیکن۔ اس کی بیوی سِدرہ بہت بے صبری اور ناشکری تھی۔ ہر وقت اپنے میاں کو طعنے دیتی رہتی کہ تم نکمے ہو، کاہل ہو۔ اتنے تھوڑے پیسے کماتے ہو کہ بہت مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ یہ پیشہ چھوڑ کر کوئی دوسرا پیشہ اپناؤ کہ کچھ پیسے تو مِلیں۔

ایک دن سِدرہ نے بہت چخ چخ کی تو حارث بولا "تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"ایسا کرو، نجومی بن جاؤ" سدرہ بولی "کل میں بازار

گئی تو وہاں مجھے حاتم نجومی کی بیوی مل گئی۔ ایمان سے کیا ٹھاٹ تھے اس کے۔ میں تو حیران رہ گئی۔ آگے پیچھے دو دو نوکر تھے اس کے۔ کپڑے ایسے پہنے تھے کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اس نے ایک دکان سے پانچ ہزار کا ایک قالین خریدا۔ ہمیں تو پانچ روپے کی دری بھی نصیب نہیں۔ دیکھو حارث، میری مانو تم بھی نجومی بن جاؤ۔"

"اری نیک بخت!" حارث بولا "مجھے تو علم نجوم کی الف بے کا بھی پتا نہیں۔ میں نجومی کیسے بن سکتا ہوں؟"

"جب وہ حاتم کا بچہ نجومی بن سکتا ہے تو تم کیوں نہیں بن سکتے؟" سدرہ تنک کر بولی "بس، میں نے کہہ دیا۔ کل سے تم موچی نہیں، نجومی ہو گے۔"

حارث نے بیوی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بھی اپنی ضد کی پکی تھی۔ کسی طرح نہ مانی۔ آخر میاں کو بیوی کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

دوسرے دن صبح کو حارث نے چوغہ پہنا، کمر میں

پٹکا باندھا، سر پر عمامہ (صافہ) رکھا اور بازار جا کر ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ "آیئے، صاحبان آیئے، غیب کا حال معلوم کیجئے۔ میں آپ کے ستاروں کی چال بدل کر آپ کی ہر مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ آیئے، آیئے، مت شرمایئے، مت گھبرایئے، بہت پہنچا ہوا نجومی ہوں۔"

آن کی آن میں اس کے گرد لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ اس مجمع میں بغداد کا ایک مشہور جوہری بھی تھا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا حارث کے پاس آیا اور بولا "یا شیخ، میں ایک جوہری ہوں۔ بادشاہ سلامت نے مجھے اپنا تاج پالش کرنے کے لئے دیا تھا۔ اس کا ایک ہیرا غائب ہو گیا ہے۔ اگر وہ ہیرا نہ ملا تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"ہوں!" حارث آسمان کی طرف دیکھ کر بولا "تمہارا ستارہ گردش میں ہے۔ اسے گردش سے نکالنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔ اب تم جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد آنا۔"

کہنے کو تو اس نے یہ کہہ دیا، مگر دل میں گھبرا رہا

تھا کہ ہیرے کے چور کا پتا کیسے چلاؤں گا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ چور کون ہے اور ہیرا کہاں ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "اری سِدرہ! تو نے اپنے شوہر کو کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔"

اتفاق کی بات، اس مجمع میں جوہری کی بیوی بھی موجود تھی اور اتفاق کی بات کہ اس کا نام بھی سدرہ تھا۔ حارث کی یہ بات سن کر وہ سمجھی کہ اس نجومی کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہیرا میں نے چُرایا ہے۔ وہ تھر تھر کانپتی ہوئی آگے بڑھی اور حارث کے چوغے کا دامن پکڑ کر بولی "یا شیخ، مجھے معاف کر دیجئے۔ میں اس جوہری کی بیوی ہوں۔ میں نے ہیرا چرانے کی نیّت سے نہیں لیا تھا۔ میں اسے صرف دیکھنا چاہتی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے واپس کروں؟"

حارث نے کہا "جو لوگ اپنے گناہوں کا اقرار کرکے سچّے دل سے توبہ کرتے ہیں، خدا انہیں معاف کر دیتا ہے۔ اب تم فوراً گھر جاؤ اور وہ ہیرا چپکے سے

اپنے خاوند کے چوغے کی جیب میں ڈال دو۔"

ایک گھنٹے بعد جوہری واپس آیا تو حارث نے کہا "تمہارے ستارے کی چال کچھ بگڑی ہوئی تھی۔ اب میں نے ٹھیک کر دی ہے۔ تم گھر جاؤ۔ ہیرا تمہارے چوغے کی جیب میں ہے۔"

جوہری اُلٹے قدموں گھر گیا اور چوغے کی جیب ٹٹولی تو ہیرا اس میں موجود تھا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے ایک تھیلی میں سونے کی اشرفیاں بھریں اور حارث کے پاس آ کر بولا "یا شیخ، آپ تو سچ مچ بہت پہنچے ہوئے نجومی ہیں۔ ہیرا میرے چوغے کی جیب میں پڑا تھا۔ لیجئے، میری طرف سے یہ حقیر نذرانہ قبول کیجئے۔" اس نے اشرفیوں کی تھیلی حارث کے ہاتھوں میں تھما دی۔

حارث نے گھر آ کر تھیلی سدرہ کو دی اور بولا "لو، یہ اشرفیاں۔ اب مجھ سے یہ کام مت کروانا۔ آج تو میں بچ گیا۔ روز روز نہیں بچوں گا۔" سدرہ اشرفیاں دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ اس نے حارث کی بات سنی اَن

سنی کر دی اور اشرفیاں گننے لگی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد حارث دکان پر جانے لگا تو سدرہ نے کہا "کدھر چلے؟ اب تم حارث موچی نہیں، بغداد کے مشہور نجومی حارث بن وارث ہو۔ بازار جاؤ اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبیں خالی کراؤ۔"

زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ طاقت ور کی بات ماننا پڑتی ہے۔ حارث نے چوغا پہنا، کمر میں پٹکا باندھا، سر پر عمامہ رکھا اور بازار جا کر ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ لوگ جمع ہونے لگے۔ کوئی کچھ پوچھتا تو کوئی کچھ۔ حارث یوں ہی اٹکل پچو جواب دے کر ان سے پیسے اینٹھ لیتا۔ شام کو گھر واپس آیا تو اس کی جیب بھری ہوئی تھی۔

ایک دن صبح کو وہ بازار جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ باہر نکلا تو دیکھا دو سپاہی کھڑے ہیں۔ انہوں نے ادب سے سلام کیا اور بولے "بادشاہ سلامت نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ ابھی اسی

وقت ہمارے ساتھ چلیئے۔"

حارث شاہی محل میں پہنچا تو وہاں بادشاہ اور وزیروں کے علاوہ شہر کا کوتوال بھی موجود تھا۔ وہ دل میں ڈرا کہ خدا خیر کرے۔ کہیں بادشاہ کو معلوم تو نہیں ہو گیا کہ میں اصلی نجومی نہیں ہوں اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسے بٹورتا ہوں۔ اس نے جھک کر بادشاہ کو تین فرشی سلام کیئے اور ہاتھ باندھ کر، سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ بولا " پرسوں رات ہمارے خزانے سے ہیرے جواہرات کے چالیس صندوق غائب ہو گئے۔ پولیس چوروں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تم بہت اچھے نجومی ہو۔ اگر تم نے چوروں کا پتا چلا لیا تو ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔"

حارث بولا "عالی جاہ! یہ کسی ایک چور کا کام نہیں ہے۔ یہ چالیس چوروں کا کام ہے۔ ان کا کھوج لگانے میں چالیس دن لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں چالیس دن دیتے ہیں لیکن اگر تم نے چالیس دنوں میں ان چوروں کا سراغ نہ لگایا تو تمہاری کھال کھچوا کر بھس بھروا دیں گے۔"

حارث گرتا پڑتا گھر آیا اور سدرہ سے بولا "جلدی کرو اور بوریا بستر باندھ کر یہاں سے نکل چلو۔"

"کہاں چلیں؟" سدرہ نے پوچھا۔

"تمہاری اماں کے گھر" حارث نے جواب دیا۔

"میری اماں کو تو مرے دس سال ہو گئے" سدرہ بولی "مگر میں پوچھوں ہوں، یہ ایکا ایکی بوریا بستر گول کرنے کی کیوں سوجھی تمہیں؟"

حارث نے کہا "چوروں نے بادشاہ کے خزانے سے ہیرے جواہرات کے چالیس صندوق چرا لئے ہیں اور اس نے مجھے ان کا کھوج لگانے کا حکم دیا ہے۔ میں نے چالیس دن کی مہلت مانگی ہے۔ اگر میں چالیس دن کے اندر چوروں کو نہ پکڑوا سکا تو بادشاہ میری کھال کھچوا کر اس میں بھوسا بھروا دے گا۔"

"ہم کہیں نہیں جائیں گے" سدرہ نے کہا "ڈرو

مت۔ چالیس دن بہت ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے چور پکڑے جائیں۔ ہو سکتا ہے بادشاہ مر جائے۔"

حارث بولا "اور اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوئی تو؟"

"تو پھر ہم چالیسویں دن، رات کو یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ عراق کے شہر بصرہ میں میری ایک خالہ رہتی ہیں۔ وہ ہمیں پناہ دے دیں گی۔" سدرہ نے کہا۔

"لیکن ہمیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں؟" حارث نے کہا "نہ مجھے لکھنا آتا ہے نہ تمہیں۔"

"ہوں!" سدرہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی "میں روز شام کو مرتبان میں ایک کنکری ڈال دیا کروں گی۔ اس طرح معلوم ہوتا رہے گا کہ اتنے دن گزر گئے ہیں۔"

جن چوروں نے شاہی خزانے میں چوری کی تھی، ان کا ایک ساتھی شاہی محل کی جاسوسی کرتا تھا۔ اس نے اپنے سردار کو بتایا کہ بادشاہ نے بغداد کے ایک نجومی کو ہمارا کھوج لگانے پر مقرر کیا ہے۔ یہ شخص نجوم کا بہت بڑا عالم ہے۔ اس نے بادشاہ کو ہماری صحیح

تعداد بتا دی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ چالیس دن کے اندر وہ ہمیں پکڑوا دے گا۔

سردار بولا " ارے بے وقوف! چوروں کی تعداد تو ایک بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ ظاہر ہے چالیس صندوق چالیس آدمی ہی اٹھائیں گے۔ بس، اس نے بتا دیا کہ یہ چالیس چوروں کا کام ہے، لیکن یہ نجومی بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی نگرانی کرنی چاہئے۔ تم آج شام اس کے گھر جانا اور معلوم کرنا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟"

اس شام وہ چور حارث کے گھر کے پاس پہنچا تو اسے کھڑکی میں باتوں کی آواز آئی۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ اسی وقت سدرہ نے مرتبان میں ایک کنکری ڈالی اور حارث زور سے بولا " چالیس میں سے ایک گیا۔"

یہ سن کر چور کی سٹی گم ہو گئی۔ بھاگا بھاگا اپنے اڈے پر گیا اور سردار سے بولا " سچ مچ وہ بہت پہنچا ہوا نجومی ہے۔ جوں ہی میں نے اس کی کھڑکی پر کان لگائے، اس نے کہا: چالیس میں سے ایک گیا۔"

سردار نے کنکھیوں (کن اکھیوں) سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ خوف سے کانپ رہے تھے۔ سردار ان کی ہمت بندھانے کے لئے زبردستی مسکرایا اور بولا "تم نے غلط سنا ہو گا۔ کل دو آدمی جائیں اور نجومی کی کھڑکی سے کان لگا کر اس کی باتیں سنیں۔"

دوسرے دن شام کو دونوں چور چھپتے چھپاتے حارث کے گھر کے پاس پہنچے اور کھڑکی سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت سدرہ نے دوسری کنکری مرتبان میں ڈالی اور حارث زور سے بولا "دو۔۔۔۔ اب اڑتیس (38) رہ گئے۔"

دونوں چور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سردار کو بتایا کہ یہ نجومی واقعی غیب کا علم جانتا ہے۔ ہم اس کی کھڑکی کے پاس پہنچے تو اسے معلوم ہو گیا کہ ہم دو ہیں۔

سردار نے غصّے سے پیر پٹخے اور چلاّ کر بولا "تم دونوں بھی بدھو ہو۔ کل تین آدمی جائیں اور کان کھول کر دھیان سے سنیں۔"

تیسرے دن تین چور گئے، چوتھے دن چار، پانچویں
دن پانچ اور اُنتالیس (39) دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔
سِدرہ روز شام کو مرتبان میں ایک کنکری ڈالتی،
حارث زور سے کنکریوں کی تعداد بتاتا اور چور سمجھتے کہ
وہ ان کی تعداد بتا رہا ہے۔ وہ ڈر کر بھاگ جاتے۔
چالیسویں دن شام کو سردار اپنے تمام ساتھیوں کے
ساتھ حارث کے گھر پہنچا اور کھڑکی سے کان لگا کر
کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت سدرہ نے مرتبان میں آخری
کنکری ڈالی اور حارث زور سے بولا "چالیس پورے
ہوگئے۔ سدرہ رسّیاں لاؤ۔"
حارث نے رسّیاں سامان باندھنے کے لئے منگوائی
تھیں۔ سدرہ رسّیاں لانے کے لئے اٹھنا ہی چاہتی تھی
کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ حارث نے دروازہ
کھولا تو اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ سمجھا
کہ بادشاہ نے اسے پکڑنے کے لئے فوج بھیجی ہے۔ وہ
کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چوروں کا سردار اس کے قدموں پر
گر پڑا اور گڑگڑا کر بولا "شاہی خزانے میں چوری ہم

نے کی تھی۔ بادشاہ کو نہ بتائیں۔ وہ ہمارا زن بچہ کو لھو
میں پلوا دے گا۔ ہم آپ کا گھر سونے چاندی سے بھر
دیں گے۔"
حارث غصّے سے بولا "بے ایمانو! تمہارا خیال تھا کہ
تمہارے اس جُرم کا کسی کو پتا نہ چلے گا۔ ارے، ہم سے
تو دنیا کا کوئی بھید چھپا ہوا نہیں ہے۔ اب تمہاری
خیریّت اسی میں ہے کہ چوری کا سارا مال بادشاہ کو
واپس کر دو۔"
سردار نے کہا "لیکن حضور، ہم بادشاہ کے پاس
جائیں گے تو وہ ہمیں قید خانے میں ڈال دے گا، بلکہ
ہو سکتا ہے ہمارے سر قلم کروا دے۔"
"تو تم ایسا کرو" حارث بولا "سورج نکلنے سے پہلے
پہلے تمام صندوق بادشاہ کے محل کی مشرقی دیوار کے
پاس دفن کر دو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی چوری
نہیں کرو گے۔ میں بادشاہ کو تمہارے بارے میں کچھ
نہیں بتاؤں گا۔"
"حضور نے جیسا کہا، ویسا ہی ہو گا" سردار نے کہا

اور اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح کو بادشاہ کے سپاہی حارث کے گھر آئے اور اسے گھوڑے پر بٹھا کر شاہی محل لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "ہمیں اُمید ہے تم نے چوروں کا کھوج لگا لیا ہو گا اور ہمارا خزانہ مل گیا ہو گا۔"

" آپ کا خیال درست ہے، عالی جاہ" حارث بولا "لیکن حضور یہ فرمائیں کہ حضور کے نزدیک دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ اہم ہے۔ خزانہ یا چور؟ میں ان میں سے صرف ایک چیز حضور کے حوالے کر سکتا ہوں۔ دونوں چیزیں دینے سے ستاروں نے منع کر دیا ہے۔"

"ہمیں خزانہ چاہیئے۔ چوروں سے پھر کبھی نمٹ لیں گے" بادشاہ نے کہا۔

" تو پھر حضور، میرے ساتھ تشریف لائیں" حارث بولا۔

بادشاہ، وزیر اور سپاہی حارث کے پیچھے چل پڑے۔ وہ انہیں شاہی محل کی مشرقی دیوار کے پاس لے گیا اور

سپاہیوں سے کہا کہ زمین کھودیں۔ انہوں نے زمین کھودی تو اس میں سے چالیس صندوق نکلے۔

بادشاہ خوش ہو کر بولا " حارث! تم تو کمال کے آدمی ہو۔ ہم آج سے تمہیں شاہی نجومی مقرر کرتے ہیں۔"

حارث ہاتھ جوڑ کر بولا " میرے ستاروں نے مجھ سے کہا ہے کہ اب تم نجومی کا پیشہ چھوڑ دو اور موچی بن جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

بادشاہ نے حارث کو غور سے دیکھا اور بولا " ویسے تم شکل سے موچی ہی لگتے ہو۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں شاہی موچی مقرر کرتے ہیں۔ تم شاہی خاندان کے جوتے بنایا کرو گے۔"

اصلی نقلی

مصر کے شہر اسکندریہ میں ایک درزی رہتا تھا۔ نام تھا عبداللہ۔ اس کی دکان میں بہت سے کاری گر کام کرتے تھے۔ ان میں سعود نام کا ایک نوجوان بھی تھا۔ بہت خوب صورت اور لمبا تڑنگا۔ پتا نہیں اس کے ماں باپ کون تھے۔ عبداللہ نے اسے بچپن سے پالا تھا اور اپنی اولاد کی طرح چاہتا تھا۔

سعود میں جہاں بہت سی اچھائیاں تھیں، وہاں ایک بُرائی بھی تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کسی بادشاہ کا بیٹا ہے۔ بس سوتے جاگتے یہی سپنے دیکھا کرتا۔

ایک دن مصر کے بادشاہ کا وزیر اسکندریہ آیا۔ عبداللہ بڑا نامی درزی تھا۔ بڑے بڑے امیر اور سرکاری افسر اس سے کپڑے سلواتے تھے۔ وزیر نے اسے محل میں بُلوایا اور کہا "ہمارے چغے کا دامن تھوڑا سا پھٹ گیا ہے۔ اس طرح رفو کرنا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔" عبداللہ چغا (چوغہ) لے کر دکان پر آیا اور سعود کو رفو کرنے کے لئے دے دیا، کیونکہ تمام کاریگروں میں وہی سب سے ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔

دکان کی چابیاں سعود کے پاس رہتی تھیں۔ صبح کے وقت وہی دکان کھولتا اور شام کو وہی بند کرتا۔ اس دن شام کو جب سب کاریگر چلے گئے اور سعود دکان بند کرنے لگا تو اس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا چغا پہن کر دیکھوں تو سہی کیسا لگتا ہوں۔ اس نے کھونٹی سے چغا اتارا اور پہن کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ خوب صورت تو تھا ہی، چغے نے حسن میں چار چاند لگا دیئے۔

"میں شہزادہ ہوں۔ میں سچ مچ شہزادہ ہوں" اس

نے دل میں کہا "میرا باپ ضرور کوئی بادشاہ ہے۔ میں
اسے تلاش کروں گا، چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں
ہو۔" اس نے اڑے وقتوں کے لئے کچھ رُوپے بچا کر
رکھے تھے۔ وہ جیب میں ڈالے اور راتوں رات
اسکندریہ سے رخصت ہو گیا۔

وہ جس بستی سے گزرتا لوگ تعجب کرتے۔ سوچتے
اتنا بڑا آدمی اور پیدل جا رہا ہے۔ سعود تاڑ گیا کہ لوگ
اسے دیکھ کر حیرت کیوں کر رہے ہیں۔ اس نے اگلے
گاؤں میں پہنچ کر ایک مریل سا گھوڑا خریدا اور اس پر
سوار ہو کر آگے چل دیا۔

تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ ایک گھڑ سوار ملا۔ بیس
بائیس برس کی عمر، چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ اس
نے سعود کو بتایا کہ میرا نام ہاشم ہے اور میں مصر کے
ایک پاشا یوسف کا بھتیجا ہوں۔ سعود نے بھی اسے کچھ
ایسی ہی باتیں بتائیں اور وہ دونوں جلد ہی گہرے
دوست بن گئے۔

شام کو وہ ایک قصبے کی سرائے میں ٹھہرے۔ کھانا

کھا کر سونے لیٹے تو ہاشم نے ایک عجیب بات بتائی۔
اس نے کہا "یوسف پاشا کا انتقال ہو چکا ہے۔ مرتے
وقت انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم میرے بھتیجے نہیں،
بلکہ ملک لیبیا کے بادشاہ کے بیٹے ہو۔ تمہارے پیدا
ہونے سے پہلے نجومیوں نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ جب
یہ بچہ پیدا ہو تو اسے اس وقت تک نہ دیکھنا جب تک
وہ بائیس سال کا نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے آپ نے
اسے دیکھا تو وہ مر جائے گا۔

"بادشاہ کو دکھ تو بہت ہوا مگر کرتا بھی کیا۔ یوسف
پاشا اس کا بچپن کا دوست تھا اور مصر کے دارالسلطنت
قاہرہ میں رہتا تھا۔ میرے والد نے مجھے پیدا ہوتے ہی
پاشا کے پاس بھیج دیا اور اس نے مجھے پال پوس کر بڑا
کیا۔ اس نے مرنے سے پہلے مجھے بتایا کہ تم اس سال
رمضان کی چار تاریخ کو پورے بائیس سال کے ہو جاؤ
گے۔ اس دن تم السّراج کے مقام پر جانا جو اسکندریہ
سے چار دن کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کچھ لوگ تمہارا
انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں تم یہ خنجر دکھانا اور کہنا

کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔"

"وہ خنجر کہاں ہے؟" سعود نے جلدی سے پوچھا۔

"میری پیٹی میں" ہاشم نے جواب دیا۔

یہ عجیب و غریب کہانی سن کر سعود کے دل میں لالچ نے گھر کیا۔ اس نے سوچا "کاش! میں اس کی جگہ ہوتا۔ اب یہ تو کچھ دنوں میں ایک سلطنت کا وارث بن جائے گا اور میں یوں ہی جوتیاں چٹخاتا پھروں گا۔" اس نے ہاشم کی طرف دیکھا جو بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ یکایک اس کے دل میں ایک خطرناک خیال آیا۔ وہ چپکے سے اٹھا، ہاشم کی پیٹی سے خنجر نکالا اور اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا ہو گیا۔

اس دن رمضان کی پہلی تاریخ تھی اور سعود کو چار تاریخ تک السّراج کے مقام پر پہنچنا تھا۔ لیکن وہ ہاشم کے تیز رفتار گھوڑے پر تیسرے ہی دن رات کو وہاں پہنچ گیا۔ یہاں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور بیچ میں ایک میدان تھا جس میں کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے۔ سعود نے ایک درخت کے نیچے گھوڑا

باندھا اور پیر پسار کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح کو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ سعود ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد پندرہ بیس گھڑ سوار میدان میں آئے اور ایک درخت کے پاس ٹھہر گئے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بھی تھا جس کی پگڑی میں ایک بہت بڑا لعل جگ مگا رہا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور باقی سب لوگ ادب سے اس کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سعود نے سوچا یہی بادشاہ ہے۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا، جھک کر تین دفعہ سلام کیا اور بولا "میں ہی وہ شخص ہوں جس کی حضور کو تلاش ہے۔ یہ رہا میرا خنجر۔"

بادشاہ نے خنجر دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر سعود کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ عین اسی وقت کسی شخص کی دور سے آواز آئی "ٹھہریئے! ٹھہریئے!" سعود نے سر اٹھا کر آواز کی طرف دیکھا تو اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہاشم اس کے مریل گھوڑے پر سوار

چلا آ رہا تھا۔

"یہ شخص مکار ہے، دھوکے باز ہے" ہاشم چیخ کر بولا "اصل شہزادہ میں ہوں۔"

بادشاہ کے سپاہی حیرت سے آنکھیں پھاڑے کبھی ہاشم کو دیکھتے اور کبھی سعود کو۔ آخر ان کی نگاہیں بادشاہ کے چہرے پر جم گئیں کہ دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔

بادشاہ نے غصے سے ہونٹ کاٹا اور کڑک کر بولا "یہ نوجوان پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اسے گھوڑے کی پیٹھ سے باندھ دو۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ایسی سزا دیں گے کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں۔"

حکم کی دیر تھی، سپاہیوں نے ہاشم کی مشکیں کس دیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر اوندھا لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا۔ دو دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد بادشاہ اپنے ملک لیبیا کی سرحد میں داخل ہوا۔ سعود بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھا بادشاہ کے پہلو میں چل رہا تھا اور ہاشم گھوڑے کی پیٹھ سے بندھا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ تمام گاؤں، قصبے اور شہر دلہن کی طرح سجائے گئے تھے۔ گلی

کوچوں میں جھنڈیاں لگی تھیں اور چوکوں میں خوب صورت دروازے لگے تھے۔ شاہی جلوس جدھر سے گزرتا، لوگ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے۔

شاہی محل میں ملکہ اپنے پیارے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ شاہی جلوس محل میں داخل ہوا تو نقارچیوں نے نقارے بجا بجا کر اس کی آمد کا اعلان کیا۔ ملکہ مارے خوشی کے ننگے سر، ننگے پیر، دوڑی دوڑی آئی اور بے اختیار سعود کو گلے لگا لیا مگر پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹی اور بولی "نہیں، نہیں۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔"

"آپ کیا فرما رہی ہیں ملکۂ عالیہ؟" بادشاہ نے کہا "یہی آپ کا بیٹا ہے۔ اسے سینے سے لگا کر کلیجا ٹھنڈا کیجیے۔"

"نہیں، نہیں" ملکہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا، ہاشم دربانوں کو دھکے دیتا ہوا اندر آیا اور بادشاہ کے قدموں میں سر رکھ کر

بولا "آپ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیجئے۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

بادشاہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے کہا "اس پاگل کو کس نے چھوڑ دیا ہے؟ پکڑ لو اسے اور زنجیروں میں جکڑ کر کال کوٹھڑی میں بند کر دو۔ کل صبح ہم اس کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔"

"ٹھہریئے!" ملکہ آگے بڑھ کر بولی "میں نے اس نوجوان کو پہلی دفعہ دیکھا ہے مگر پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھچا جا رہا ہے۔ میری ممتا کہہ رہی ہے کہ یہی میرا بیٹا ہے۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" بادشاہ بولا "السّراج کے مقام پر یہی نوجوان مجھے ملا تھا اور مجھے وہ نشانی دکھائی تھی جو میں نے یوسف پاشا کو دی تھی۔"

ہاشم نے کہا "جب میں سو رہا تھا تو اس دھوکے باز نے وہ خنجر میری پیٹی سے نکال لیا اور میرے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔"

"یہ غلط ہے، عالی جاہ" سعود بولا "یہ شخص اسکندریہ

کا ایک معمولی درزی ہے اور آپ کا بیٹا بن کر تاج و تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

"آہ!" بادشاہ سر پکڑ کر بولا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"حضور یوسف پاشا ہی سے کیوں نہیں معلوم کر لیتے؟" ملکہ نے کہا۔

"وہ مر چکا ہے" بادشاہ نے جواب دیا۔

"ہمیں جلدبازی نہیں کرنی چاہئے" ملکہ نے کہا "حضور مجھے تین دن کی مہلت دیں۔ اِن شاءَ اللہ میں ثابت کر دکھاؤں گی کہ ہمارا اصلی بیٹا کون ہے۔"

ملکہ نے زنان خانے میں آ کر بہت سوچا، بہت مغز کھپایا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

ملکہ کی ایک منہ چڑھی باندی فرحت، بہت عقل مند اور ہوشیار تھی۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "ملکہ عالیہ اجازت دیں تو بندی کچھ عرض کرے۔"

"اجازت ہے" ملکہ نے کہا۔

"حضور، ان نوجوانوں کی گفت گو سے میں نے یہ

انداز لگایا ہے کہ ان میں سے ایک شہزادہ ہے اور دوسرا درزی۔"

"لیکن ہم یہ کیسے ثابت کریں گے؟" ملکہ نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ تنہائی میں عرض کروں گی۔"

"تخلیہ!" ملکہ نے تالی بجا کر کہا۔ لونڈیوں اور باندیوں نے جھک کر تین فرشی سلام کیے اور اُلٹے قدموں باہر نکل گئیں۔ فرحت نے ملکہ کے کان سے منہ لگا دیا اور دونوں دیر تک کھسر پھسر کرتی رہیں۔

دوسرے دن بادشاہ نے دربار لگایا۔ دونوں نوجوان دربار میں پیش کیے گئے۔ بادشاہ نے ملکہ سے کہا "اب آپ ثابت کریں کہ ان میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟"

"عالی جاہ!" ملکہ بولی "ان دونوں کو کپڑا، قینچی اور سوئی دھاگا دے کر الگ الگ کمروں میں بند کر دیا جائے۔ یہ آج شام تک ایک خوب صورت سی پوشاک

سیئیں گے۔ جس پوشاک کی کاٹ اور سلائی بے عیب ہو گی وہی شہزادہ ہو گا۔"

امتحان کچھ عجیب سا تھا۔ بادشاہ پہلے تو کچھ ہچکچایا مگر پھر راضی ہو گیا۔ سعود اور ہاشم کو کپڑا اور سینے پرونے کا سامان دے کر الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔

دوسرے دن صبح کو پھر دربار لگا۔ تمام وزیر اور امیر جمع ہوئے۔ سعود کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں مگر ہاشم کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ سعود نے آگے بڑھ کر پہلے اپنی پوشاک پیش کی۔

بادشاہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ بولا "واہ وا! سبحان اللہ! کتنی خوب صورت پوشاک سی ہے۔ کمال کر دیا! ہمارے شاہی درزی بھی ایسی پوشاک نہیں سی سکتے۔"

ملکہ نے مسکرا کر ہاشم کی طرف دیکھا اور بولی "نوجوان، اب تم اپنی پوشاک دکھاؤ۔"

ہاشم نے ان سِلا کپڑا فرش پر پٹخ دیا اور بولا "حضور، یوسف پاشا نے مجھے شہسواری، تیر اندازی اور تلوار بازی سکھائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ پوشاک کس

طرح سی جاتی ہے۔"

ملکہ جلدی سے اٹھی اور ہاشم کو سینے سے لگا کر بولی "میرا دل کہہ رہا تھا کہ تو ہی میرا بیٹا ہے۔ اب اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہا۔ جہاں پناہ! اب بھی آپ نہیں سمجھے کہ شہزادہ کون ہے اور درزی کون؟"

"او دھوکے باز، فریبی لڑکے!" بادشاہ نے سعود سے کہا "سچ سچ بتا تو کون ہے اور یہ سوانگ کیوں رچایا۔ ورنہ یاد رکھ! تیرے سارے بخیے اُدھیڑ دوں گا۔"

سعود کا منہ فق ہو گیا۔ سارا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا اور بولا "عالی جاہ! مجھے معاف کر دیں۔ میں ایک بدنصیب درزی ہوں۔ آپ کا حقیقی بیٹا ہاشم ہے۔ مجھے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔"

"اسے معاف کر دیجئے، حضور" ہاشم نے کہا "لالچ واقعی انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ آیندہ ایمان داری کی زندگی بسر کرے گا۔"

"حضور، لڑکا بڑا اچھا کاریگر ہے" ملکہ نے کہا "ہم سفارش کرتے ہیں کہ اسے شاہی درزیوں میں شامل کر

لیا جائے۔ کیوں لڑکے، تمھیں دھوتی شلوار سینی آتی ہے؟"

سعود سر جھکا کر بولا "حضور، زنانہ کپڑوں کا تو میں ماہر ہوں۔ ہر قسم کے غرارے، شرارے، بیل باٹم، بیگی شرٹ اور چوڑی دار پاجامے سی سکتا ہوں۔"

بادشاہ خوش ہو کر بولا "ہم شہزادے اور ملکہ کی سفارش منظور کرتے ہیں۔ آج سے یہ شاہی درزی ہے لیکن ہم نے اپنے درزیوں کو قسم قسم کے خطاب دے رکھے ہیں۔ اسے کیا خطاب دیا جائے؟"

"شہزادہ" ملکہ نے کہا اور بادشاہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

کیفے ڈی جٹ

"ہیلو، بٹ!" انور جٹ نے اپنے لنگوٹیا یار، رشید بٹ، کو آواز دی جو بغل میں کاغذوں کا پلندا دبائے تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔

"کوئی ضروری کام ہے؟" انور جٹ نے رشید بٹ سے پوچھا۔

"ہاں" رشید بٹ نے جواب دیا "ایک سرکاری محکمے میں کلرکوں کی چند اسامیاں خالی ہوئی ہیں، آخ تھو۔ میں نے بھی درخواست دی تھی، آخ تھو۔ آج انٹرویو ہے، آخ تھو۔ وہیں جا رہا ہوں۔ آخ تھو۔"

"مگر یہ آخ تھو آخ تھو کیوں؟" انور جٹ نے

پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے پتا ہے سرکاری نوکری کسی تگڑی سفارش یا بھاری رشوت کے بغیر نہیں ملتی اور میرے پاس نہ سفارش ہے نہ رشوت کے لئے پیسے۔ بی اے کرنے کے بعد دو سال سے بے کار پھر رہا ہوں۔"

"تو پھر مسٹر آخ تھو، فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ آؤ، میرے ساتھ چلو۔"

"مگر کہاں؟" رشید بٹ نے پوچھا۔

"میرے ایک رشتے دار، جمیل جٹ، کا مال روڈ پر ریسٹورنٹ ہے، کیفے ڈی جٹ۔ اسے ایک ضروری کام سے گوجرانوالہ جانا ہے۔ شام تک واپس آئے گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کے دِن اُس کا ریسٹورنٹ میں سنبھال لوں۔ میں اکیلا سارا کام نہیں کر سکتا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ کھانا مفت۔ چائے مفت۔ اِس کے علاوہ ڈھیر ساری بخشیش یعنی ٹپ۔"

جب وہ کیفے ڈی جٹ پہنچے تو کیفے کا مالک جمیل جٹ اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ علیک سلیک کے

بعد انور جٹ نے جمیل جٹ سے کہا " اِن سے ملو۔ یہ
ہیں میرے دوست رشید بٹ بی اے۔ میں انہیں بھی
لے آیا ہوں۔ کام کاج میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ اُمید
ہے تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"
" ارے نہیں" جمیل جٹ مسکرا کر بولا " مجھے تو
خوشی ہوئی، کیوں کہ عبدالرزاق بیرا چھُٹی لے گیا ہے۔
خیر، میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ اور ہاں، کل رات
میرے بڑے بھائی کا راول پنڈی سے فون آیا تھا۔ وہ
آج کسی وقت لاہور آ رہے ہیں۔ ذرا خبطی سے ہیں۔
اُنہیں سٹِنگ رُوم میں بٹھا دینا اور جب تک میں نہ
آؤں، جانے نہ دینا۔ اچھا، خدا حافظ۔"
" چلو، مسٹر بٹ" انور جٹ آستینیں چڑھا کر بولا
"میں کاؤنٹر سنبھالتا ہوں، تم گاہکوں کو سنبھالو۔ وہ دیکھو،
ایک گاہک آیا ہے۔ پوچھو، کیا چاہتا ہے۔"
ایک نوجوان بہت تنگ جینز اور شرٹ پہنے، مُنہ سے
سیٹی بجاتا ہوا اندر آیا اور ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر
بیٹھ گیا۔ وہ مسلسل سیٹی بجائے جا رہا تھا۔ رشید بٹ

دوڑ کر اُس کے پاس پہنچا اور بولا " سر، یہ شریفوں کا
ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں اعلیٰ خاندان کی خواتین آتی ہیں۔
یہاں اِس قسم کی حرکتیں کرنا بُرا سمجھا جاتا ہے۔"
" آئی سی" نوجوان نے سیٹی بجا کر کہا " دراصل
آج میں بُہت خوش ہوں۔"
" کیا میں جناب کی اِس خوشی کی وجہ پُوچھ سکتا
ہوں؟" بٹ نے کہا۔
" میری بیوی واپس آ گئی ہے" نوجوان بولا۔
" اوہ !" بٹ اُچھل کر بولا " محترمہ کہاں تشریف
لے گئی تھیں ؟"
" میکے چلی گئی تھی، رُوٹھ کر" نوجوان نے کہا۔
" تو پھر سر، یہ بین یعنی سیٹی اُس کے سامنے
بجاتے۔ یہاں کیوں پھونک ضائع کر رہے ہیں؟ ویسے،
بائی دی وے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
بٹ نے پوچھا۔
نوجوان بولا " دو شامی کباب، گرما گرم۔ ایک پلیٹ
چپس۔ ایک کپ کافی، ملائی والی۔"

اب کیفے میں آہستہ آہستہ گاہک آنے لگے تھے اور بٹ اور جٹ بہت پھرتی دکھا رہے تھے۔

"آپ کا بل، سر" بٹ نے ایک گاہک کے سامنے بل رکھتے ہوئے کہا "35 روپے۔"

"یہ لو 40 روپے" گاہک بولا "5 روپے تمہاری ٹپ۔"

"اوہ! تھینک یُو، سر۔ آپ بہت مال دار معلوم ہوتے ہیں، ماشاء اللہ" بٹ خوش ہو کر بولا۔

"ہاں۔ ایسا ہی سمجھ لو" گاہک نے کہا "میرے ماں باپ آئرن (Iron) اور اِسٹیل (Steel) کا کاروبار کرتے ہیں اور میں اِس کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔"

"کیا مطلب ؟" بٹ بولا "یعنی آپ کی والدہ آئرن یعنی اِستری کرتی ہیں اور آپ کے والد صاحب اِسٹیل (Steal) یعنی چوری کرتے ہیں؟"

"ہا ہا ہا ! " گاہک قہقہہ لگا کر بولا "بہت خوش مزاج معلوم ہوتے ہو اور پڑھے لکھے بھی۔ اگر تم اِسی طرح گاہکوں کو ہنساتے رہے تو تمہارا کیفے خوب چلے گا۔

ہا ہا ہا!"

"ویٹر!" ایک عورت کی آواز آئی۔ یہ کوئی انگریز خاتون تھی۔ بٹ اُس کے پاس گیا اور ادب سے بولا "یس، میڈم۔"

خاتون بھڑک کر بولی "ہم میڈم نائیں ہائے۔ ابھی ہم نے شاڈی نائیں بنایا۔"

بٹ نے جلدی سے کہا "اوہ! آئی ایم سوری، مِس......"

"مِس آس بورن" خاتون بولی اور پرس میں سے آئینہ نکال کر بال ٹھیک کرنے لگی۔

"اوکے، مِس آس بورن۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" بٹ نے کہا۔

"ڈیکو" مِس آس بورن بولی "ایک چکن برگر مانگتا۔ ایک کافی مانگتا۔ ایک کوک مانگتا۔ شوگر نہیں مانگتا۔ کریم بھی نہیں مانگتا۔ اور سُنو، تھوڑا گور بھی لاؤ۔"

"گور......؟" بٹ سر کھجانے لگا "یہ کون سی ڈِش ہے؟"

"ویل، تُم کیا بنڈر کے مافک سر کُھجاتا ہائے؟" مِس آسبورن بولی "گور نہیں جانتا؟ ہم نے پاکستان کے ایک ویلیج میں کھایا تھا۔ ہم کو بہوٹ اچا لگا۔ اب پھر کھانا مانگتا۔"

"او کے، مِس۔ میں Chef (باورچی) سے پوچھتا ہوں کہ یہ ڈش تیار ہے یا نہیں۔" بٹ بھاگا بھاگا انور جٹ کے پاس گیا اور بولا "یہ انگریز خاتون گور مانگتی ہے۔ یہ کیا بلا ہے؟"

"گور؟" انور جٹ سوچتے ہوئے بولا "گور تو قبر کو کہتے ہیں۔ اب ہم اِس کے لئے یہاں قبر کھو دیں؟"

"کہتی ہے، ہم نے پاکستان کے ایک گاؤں میں کھایا تھا" بٹ نے بتایا۔

"اوہ! بیڑا غرق۔ یہ کہیں گُڑ کو تو گور نہیں کہہ رہی؟" جٹ نے ہنس کر کہا "کہنا، گور ختم ہو گیا ہے۔ اب کل بنائیں گے۔"

"مِس، گور ختم ہو گیا ہے۔ کل بنائے گا" رشید بٹ نے مِس آسبورن کو بتایا۔

"کوئی باٹ نائیں" مِس آسبورن نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولی "ڈیکو، ہم نے تمہیں پہلے کہیں ڈیکا ہے۔ تُم کبھی لنڈن گیا؟"

"لندن؟" رشید بٹ نے کہا "لندن تو بہت دُور ہے۔ میں تو ابھی تک بھائی پھیرو نہیں گیا ہوں۔"

"یہ ٹو بہوٹ بُرا باٹ ہائے" مِس آسبورن سر ہلا کر بولی "تُم کو اپنے بھائی کے پاس ضرور جانا چاہیئے۔"

"بھائی پھیرو میرا بھائی نہیں ہے" رشید بٹ مسکرا کر بولا "یہ لاہور کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔"

تین چار گھنٹے کیفے ڈی جٹ میں خوب گہما گہمی رہی۔ رشید بٹ نے 60'50 کے قریب گاہک بھگتائے اور اسے 300 روپے بخشیش (ٹپ) ملی۔ پھر آہستہ آہستہ گاہکوں کا رش ختم ہو گیا اور آخر کار کیفے ڈی جٹ میں صرف بٹ اور جٹ رہ گئے۔

"یار جٹ" بٹ کاؤنٹر کے قریب اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا "کلرکی سے تو یہ کام اچھا۔ 300 روپے بخشیش ملی۔ یار جٹ، تم مجھے یہیں نوکر کرا دو۔"

"ٹھیک ہے" جٹ نے کہا "اگر تمہاری یہی مرضی
ہے تو میں جمیل جٹ سے بات کروں گا۔"
اُن کی گفت گو جاری تھی کہ کیفے ڈی جٹ کا
دروازہ کُھلا اور اَدھیڑ عُمر کا ایک آدمی کاندھے پر تھیلا
لٹکائے اندر داخل ہوا۔
"جمیل جٹ کا بڑا بھائی!" انور جٹ نے رشید بٹ
کے کان میں کہا "میں شرط لگاتا ہوں، یہ وہی ہے۔"
"تمہارا خیال دُرست ہے" رشید بٹ بولا "چلو،
اس کا استقبال کریں۔"
"السلامُ علیکم" انور جٹ نے آگے بڑھ کر اُس
آدمی سے کہا "آپ غالباً مسٹر جمیل جٹ سے ملنے
آئے ہیں۔"
"جی ہاں، جی ہاں" آدمی نے تھیلا میز پر رکھتے
ہوئے کہا "وہ کہاں ہیں؟"
"گوجرانوالہ گئے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ بس
آتے ہی ہوں گے۔"
"میں یہاں تشریف رکھنے نہیں آیا ہوں" آدمی

نے کہا "مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ کل آجاؤں
گا۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔
بٹ نے اُسے پکڑ لیا اور بولا "دیکھئے جناب، آپ کا
جو بھی نام ہو، آپ کو تھوڑی دیر، بس تھوڑی سی دیر
انتظار کرنا پڑے گا۔ آیئے، سٹنگ رُوم میں تشریف لایئے۔"
"کیا سٹنگ رُوم میں کوئی پائپ......" آدمی کچھ کہنا
چاہتا تھا کہ انور جٹ اُس کی بات کاٹ کر بولا "ہاں،
ہاں۔ آپ شوق سے وہاں پائپ پیجئے، سگار پیجئے، سگرٹ
پیجئے۔ جو چاہے پیجئے۔ ہمیں کوئی اِعتراض نہ ہو گا۔"
یہ کہہ کر اُس نے اُس آدمی کو سٹنگ رُوم میں
دھکیلا اور باہر سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔
اُسی وقت کیفے کا دروازہ کُھلا اور جمیل جٹ اَدھیڑ
عُمر کے ایک آدمی کے ساتھ اندر آیا۔ جٹ اور بٹ
دوڑ کر اُس کے پاس گئے۔
رشید بٹ بولا "آپ کے بڑے بھائی تشریف لے
آئے ہیں۔ ہم نے اُنہیں سٹنگ رُوم میں بند کر دیا ہے۔"
"میرے بڑے بھائی؟" جمیل جٹ حیرت سے بولا

"میرے بڑے بھائی تو یہ ہیں۔" اُس نے اُس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو اُس کے ساتھ آیا تھا۔

"اگر یہ آپ کے بھائی ہیں تو وہ کون ہے جسے ہم نے سٹنگ رُوم میں بند کر دیا ہے؟" رشید بٹ نے کہا۔

اسی لمحے سٹنگ رُوم کے اندر سے دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ جمیل جٹ نے لپک کر دروازہ کھولا تو اندر سے بڑے میاں لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے۔

"ارے!" جمیل جٹ زور سے اُچھل کر بولا "یہ تو پائپ مرمت کرنے والا ہے۔ اِسے میں نے بُلایا تھا۔ کچن میں پانی کا ایک پائپ لیک کر رہا ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ!" رشید بٹ بولا "ارے بڑے میاں، آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟"

"میں تو بتانا چاہتا تھا" بڑے میاں بولے "تم نے مجھے مُہلت ہی نہ دی۔ کمرے میں دھکّا دے کر دروازہ بند کر دیا۔"

ہا ہا ہا! ہو ہو ہو! ہی ہی ہی! سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ISBN 969-0-00006-3

Rs.75.00